منٹو کے نسوانی کردار



امجد جاوید

منٹو کے نسوانی کردار

ترتیب و تحقیق

امجد جاوید

ضابطہ

نام کتاب	......	منٹو کے نسوانی کردار
ترتیب و تحقیق	......	امجد جاوید
ناشر	......	علم و عرفان پبلشرز 34 اُردو بازار، لاہور
اہتمام	......	محمد اشرف یونیک ایجوکیشنل پبلشرز
سرورق	......	حافظ عبدالرشید
کمپوزنگ	......	محمد اصفہان، شکیل احمد
مطبع	......	جوہر رحمانیہ پرنٹرز، لاہور
تعداد	......	500
باراول	......	مئی 2004ء
قیمت	......	-/120 روپے

انتساب!

اپنے دوستوں

کے نام

آئینہ

منٹو کے عہد کی المیاتی تصویریں

بہت عرصے تک میرے ذہن میں یہ کچا سوال گونجتا رہا کہ ہم خوب صورتی ہی کیوں پسند کرتے ہیں۔۔۔۔ بدصورتی کیوں نہیں؟۔ میرے اس سوال کی وضاحت میں مثالیں طلب کی جاتی رہیں۔ اور میں کئی دوسری مثالوں کے ساتھ ایک یہ مثال بھی دیتا کہ ایک عورت جو خوبصورت نہیں، بدصورت ہے، اس میں بدصورتی کی تمام علامتیں پائی جاتی ہیں، جو ہمارے ہاں ایک معیار سمجھا جاتا ہے۔ لیکن وہ پھر بھی ایک انسان ہے، اور جیتے جاگتے انسان کے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے۔ اس میں چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے خوبصورت لوگوں سے بھی زیادہ شدید۔ اس میں غرور، تکبر اور دوسروں کو تابع کرنے کی خواہش جیسے منفی جذبے بھی نہیں ہوں گے۔ لیکن پھر بھی ہم بدصورت عورت کو پسندیدگی کے معیار پر نہیں لاتے۔ ایسا کیوں ہے؟

ڈھیروں جواب،؟ ڈھیروں بحثیں اور ڈھیروں دلائل اس سوال کے جواب میں دیئے جاتے ہیں۔ جواب کی تلاش کے لیے اس سوال کو کئی طرح سے چھیلا گیا، پرکھا گیا اور مختلف صورتوں میں ڈھالا گیا۔ مگر کوئی حتمی جواب اطمینان کا باعث نہ بن سکا۔ ہاں مگر ایک جواب! کہ بدصورتی ہو گی تو خوبصوری کو امتیاز ہو سکے گا۔ بدصورتی بھی اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی خوبصورتی۔ عمل اور ردِ عمل کے اصول کے مطابق الجھنوں سے گوندھے ہوئے سوالوں کے جواب بھی الجھن زدہ ہوتے ہیں۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جواب بالکل صاف اور شفاف ہوں۔ ایک بے رنگ پھیکے سوال کے ممکن ہیں بے شمار دلچسپ اور رنگین جواب ہمیں میسر آ جائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا اس انسانی فطرت کا اظہار ہے جو اسے قدرت کی طرف سے ودیعت ہے۔ جو خود کو سمجھنے کی صورت میں کائنات کی وسعتوں میں پھیلتا ہے اور ردِ عمل کے طور پر خود میں انکشافات کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو دیکھ کر خود ہی حیران رہ جاتا ہے۔

''تاروں بھرا آسمان، رات کا پراسرار سناٹا، سورج کی دہکتی لال آنکھ، زمین کی گیلا بھینا لمس، روزانہ نہیں، بار بار نہیں، کسی منصوبے کے تحت نہیں لیکن کسی وقت اچانک آپ کی متمدن اور مہذب دنیا کے مرمریں حصاروں کو توڑ کر ایسا شب خون مارتے ہیں کہ آپ چونک اٹھتے ہیں، سہم جاتے ہیں۔ آپ کا تجربہ آپ کے لیے انکشاف بن جاتا ہے۔ فطرت سے آپ کی

اچانک ملاقات، آپ کوفطرت، کائنات اور خود اپنے آپ کے متعلق اتنا کچھ کہہ جاتی ہے کہ ایک حساس آدمی، وہ آدمی نہیں رہتا جو اس انکشاف سے پہلے تھا۔ ادب اور آرٹ کا ہر بڑا تجربہ انہی معنوں میں ایک انکشاف ہے۔ اس تجربے سے دوچار ہو کر آدمی وہ آدمی رہتا ہی نہیں جو اس تجربے سے پیشتر تھا۔'' (**وارث علوی. اردو افسانہ ،روایت اور مسائل صفحہ 230 .**)

''ادب کا موضوع انسان کی ذات اور اس کے جذبات کی دنیا رہی ہے۔ ایک آدمی، آدمی کے متعلق فطرت، کائنات اور خدا کے متعلق کیا سوچتا اور محسوس کرتا ہے اور اپنے گردوپیش سے اس کے جذباتی رشتہ کی نوعیت کیا ہے؟ یہ ہے آرٹ اور ادب کا موضوع (وارث علوی۔ اردو افسانہ، روایت اور مسائل صفحہ 231)

جس طرح ہر شے کا ایک مرکز ہوتا ہے، اسی طرح ادب اور خصوصاً اردو ادب کا مرکز کیا ہے؟ لفظوں سے تصویر بنانے کے لیے کینوس کے طور پر اظہار کے لیے کس شے کو لے لیا گیا ہے؟ اس کا بڑا آسان جواب ہے کہ عورت۔۔۔۔!

''ہوا یوں کہ اردو افسانہ اپنی ابتداء ہی سے طبقہ نسواں کی آزادی اور اصلاح و بہبود کی راہ پر انتہائی دردمندی کے ساتھ چل نکلا۔ ''عورت'' کا موضوع راشد الخیری اور سلطان حیدر جوش کے ہاں جائزہ نشیں اور رومانیوں کے ہاں رومانوی مثالیت کے ساتھ ظاہر ہوا۔ عورت کا تصور یلدرم کے ہاں زندگی کا محور اور پریم چند کے ہاں سراسر وفا سے عبارت تھا۔ نیاز کے ہاں عورت کا تصور اکتساب لذت کا باعث ہے۔ جبکہ علی عباس حسینی کے ہاں یہی تصور محض کہانی میں المیہ تاثر پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ مجنوں گھورکھپوری اپنی عالمانہ بردباری اور عورت کے مسحور کن تصور کے درمیان ڈانواڈول رہے جبکہ اعظم کریوی نے عورت کے تصور کے نام دیہات کا سارا رومان انتساب کیا۔ ایک طرف آزادی نسواں کی تحریک چل رہی اور چوہدری محمد علی رودلوی نے کہا

''عورت بدصورت ہو ہی نہیں سکتی۔''

۔۔۔۔۔۔احمد شجاع نے تو اس موضوع کی پیش کش کے لیے مصور اور شاعر ہونے کی آرزو کی۔ لیکن آزادی نسواں کی تحریک اور اصلاح پسندی کے جذبے تلے شاعرانہ نثر کراہ کر رہ گئی۔ قاضی عبدالغفار نے ''لیلیٰ کے خطوط'' لکھ کر اصلاح پسند اور رومان کو یکجا کیا اور بعد میں کھری حقیقت پسندی کے تحت جنسی جکڑ بندیوں سے بغاوت کا اعلان ''تین پیسے کی چھوکری'' میں کر دیا۔ اس سے آگے افسانے میں سگمنڈ فرائیڈ، لارنس اور فلا بیر کا دائرہ کار تھا۔ حجاب امتیاز علی، رومانی نقطہ

نظر اور ڈاکٹر رشید جہاں، لادین انقلابی افکار لے کر ظاہر ہوئیں تو رومانی مثالیت کے متوازی دوسری رو رشید جہاں اور عصمت چغتائی کے حوالے سے چل نکلی۔تب سے اب تک خواتین لکھنے والیوں کا ایک مروج دھڑا رومانی ہے۔ جو وحیدہ نسیم کی پوچ جذبات تک چلا گیا ہے۔اور دوسری مقبول ترین راہ عصمت کے بعد واجدہ تبسم نے نکالی۔۔۔۔۔۔۔زمینی بو باس کے ساتھ عورت کے احساسات اور جذبات کی اٹھان پر عصمت چغتائی کی نگراں آنکھ، کھری تصویر کشی کر پائی ہے۔اور دوسرا بڑا نام قرۃ العین حیدر کا ہے۔۔۔۔۔۔۔اس روایت کے رواں پس منظر میں رحمان مذنب، حاجرہ مسرور، واجدہ تبسم اور خدیجہ مسرور کا پسندیدہ موضوع سماجی نا انصافیوں میں گھری ہوئی عورت ہے۔ مذنب کے ہاں طوائف کے گرد و پیش کے ماحول کی جزائیات توجہ طلب ہے۔(''گوری گلاباں''، ''لال چوبارہ''، ''چڑھتا سورج''، ''باسی کلی'') تکنیکی اعتبار سے ان چاروں افسانوں کا ابتدائیہ عصمت کی طرح جزائیات نگاری کے سبب خاموشی کے ساتھ رفتہ رفتہ پھیلا ہے اور آخر میں منٹو کے افسانوں کی طرح یکلخت سکڑ کر یا نئی ترتیبی ہیئت اختیار کر کے چونکا دیتا ہے۔۔۔''(اردو افسانے کی روایت . ڈاکٹر مرزا حامد بیگ صفحہ103-104)

کوئی بھی فنکار اپنے عہد سے انحراف نہیں کر سکتا۔منٹو کو جو عہد میسر آیا وہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے انتہائی کرب، بے چینی، اضطراب اور ٹوٹ پھوٹ کا عہد تھا۔

''معذرت خواہ ہوں کہ ماضی و حال تھوڑی دیر کے لیے یکجا ہو گئے۔ ورنہ ہم جس عہد کی بات لے کر چلے تھے۔ ابتذال کے ایک اور عہد کا انجام تھا۔غلامی صرف سیاست تک محدود نہیں رہتی۔زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کرتی ہے۔ایک جمے جمائے نظام کا انتشار جس میں ہر شے اپنی جگہ موجود تھی، زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے منسلک، ایک دوسرے کو تھامے ہوئے۔اس زنجیر کے سرے کہاں تک پہنچتے تھے۔اس کے پیچ، اس کے بل کس کسی سانپ کی طرح لپیٹے ہوئے تھے۔ یہ اندازہ ادب ہی سے ہو سکتا ہے جیسے مولوی نذیر احمد کا معاشرہ ان کے ناولوں میں۔مرزا دوسا کے عہد سے ذرا پہلے کا پس منظر امراؤ جان ادا میں۔منشی پریم چند کے ناولوں اور افسانوں کا معاشرتی پس منظر گسو ران میں۔سرشار کے فسانہ آزاد کا معاشرہ ایک اور معاشرہ تھا۔(لیکن ہمارا ہی۔اپنا) سیاسی اور اقتصادی حالات کے ساتھ ساتھ معاشرے کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔امرتسر کے مارشل لا کے عہد کا معاشرہ اور تھا، جس میں غالباً ''تماشا'' لکھا گیا۔دوسری عالمگیر جنگ اور منٹو کے قیام بمبئی تک کا معاشرہ اور تھا۔برعظیم کی غیر منصفانہ تقسیم اور ۱۹۴۷ کی قیامت، جس نے اپنی اپنی جگہوں پہ اپنے اپنے گور گڑھوں

میں اونگھتے ہوئے مُردوں کو ٹریکٹر چلا کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ کفن، کتبے، قبے، تعویذ کچھ بھی ساتھ نہ لے جا سکے۔ بہت سے معاشروں کو ختم کر دیا گیا۔

محلوں، ماڑیوں، کوٹھویں، گلیوں، محلوں، حماموں کے علاوہ ان زندہ مُردوں کے گورستانوں کا بھی خاص انتظام تھا۔ خاص نظام جس کے کھنڈر مالی و ذہنی، اخلاقی و جمالیاتی انحطاط کے کھنڈروں میں ہم کو عمرانی تجزیئے کے لیے طرح طرح کے نمونے ملیں گے۔ مثلاً پہلے اپنے مالک کے نام سے منسوب حویلیاں اس معاشرے میں جس کا ذکر ہمیں مقصود ہے صرف ''نام'' کی حویلیاں تھیں۔ ساجھے خاندان کی خوبیاں ختم ہونے کے بعد اب ان کا یہ حال تھا جیسے ایک ہی گھونسلے میں چیل، کوّں، کبوتروں، کوئلوں، چھپکلیوں نے انڈے دیدیئے ہوں اور ہر کوئی اپنی جگہ بنانے اور ایک دوسرے کے کھانے کے انتظار میں بیٹھا ہو۔۔۔۔۔۔''

''۔۔۔۔۔۔۔ حویلیوں کا ذکر تو یوں چل نکلا تھا کہ ایک معاشرے کی علامت تھی جو ایک ہی جھٹکے سے رہنا چاہتا تھا۔ منٹو کے عہد میں لاکھوں گھر اور بھی تو تھے۔ کرائے کے یا ذاتی، چھوٹے بڑے یا اوسط درجے کے نمائندہ۔ وضعداری کا ماتھا لیے۔ گھر جن کی دیواریں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی تھیں اور بعض اوقات بوسیدہ حالتوں میں گرا چاہتی تھیں یا ایک دوسرے کو تھامے ہوئے تھیں اور منڈیریں، قلعے اور فصیلیں تو نہیں کہ ٹاپی نہ جا سکیں۔ بڑی بوڑھیاں لاکھ چلاتی رہیں مرن جوگے باز تھوڑی آئیں گے۔ تو کاہے کو سر کھپاؤ۔

ادھر کبوتر بھی جھولیوں میں گر جاوے ہیں۔ پھڑ پھڑاتے۔ چونچوں سے گدگداتے۔ ہائے اللہ، اوئی مولا نہ بھئی چٹکیاں نہ بھرو۔ پتنگوں کے پیچ بھی الجھ جاوے ہیں۔ خط بھی تو لے آوے ہیں پتنگ موئی۔ ملاقاتوں کی جگہیں۔ آستانوں پہ، بازاروں میں، گلیوں میں۔ قسمیں اور وفائیں۔ مگر وفا تو بدنام ہی ہوئی۔ یا پھر موت نے وعدہ پورا کیا۔

جناب عشق کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی میلے کچیلے کپڑوں میں باہر کون جاتا ہے۔ کوئی سہیلی ہی مل گئی تو بن ٹھن کے چلنا چاہیے۔

اماں کا زیور بک گیا۔ موتیوں کے پرستار غائب ہو گئے۔ سپیاں بارشوں کے لیے منہ کھولے رہیں جوانی اور غربت

اس عہد کے دو عفریت ہیں

اور حقوق حیوانی

عشق منڈیریں ٹاپ کر چلا جاتا ہے۔

وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے۔۔۔حسرت کی شاعری میں محبت گھروں میں آنکھ مچولی کھیلتی ہے چلچلاتی دھوپ کو نہیں دیکھتی۔

جوانی دیوانی برقعوں میں منہ چھپائے پھرتی اور پھر شہ نشیں پر آن بیٹھتی۔ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے سے جھانکتی۔ مقفل دروازوں کے روزنوں سے چابیاں آپ سے آپ راہگیروں کے پاؤں میں آن گرتی ہیں۔کلید سازوں کے معاشرے میں ایک فقط عورت کے احترام کی کلید ہی نہیں۔استحصال، جوانی کی دیوانگی، بے خبر کا انجام اور غربت سب سے بڑی نوچیاں ہیں۔افلاس سب سے بڑا ابھڑوا اور سرمایہ دارانہ نظام جس کی ایک شکل جاگیرداری بھی ہے،سب کا سرپرست۔پیری فقیری، اولاد کی ہوس سبھی ایک ہی قبیل ہے ایک ہی شجرہ نسب۔شرافت واخلاق کا خون چوسنے والی امر بیل!

وہ عہد جس کا ذکر ہے۔سرسری سا اشارہ، مخصوص کرداروں اور منٹو کے افسانوں کا تجریدی سا پس منظر۔کب ختم ہوا؟ یا کسی صورت میں اب بھی جاری ہے؟ یا پہلے سے بھی زیادہ بھیانک ہو گیا ہے تو اس نے کون سا چہرہ پہن رکھا ہے۔۔۔۔۔۔۔؟ ان سوالات کا حل ماہرین عمرانیات کا فرض ہے۔لیکن کیا علامتی افسانے اور شاعری کے دور کا محتسب ماہرین کے جواب کو برداشت کرے گا؟ منٹو نے شدید احتساب کے عہد میں حقائق نگاری کو اپنایا تھا۔''

(ابو سعید قریشی. منٹو کے عہد کا معاشرہ . ادبیات شمارہ اپریل تا ستمبر 1989 صفحہ 217)

''بعض لوگوں کا یہ اعتراض ہے کہ منٹو کے افسانے ''سفلی جذبات کو بھڑکاتے ہیں'' اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اگر کسی شخص کے سفلی جذبات قوت برداشت کی آخری حد پر ہوں جو جنس کا نام آتے ہی مشتعل ہو سکتے ہوں تو اس میں منٹو کے افسانوں کا کیا دوش۔۔۔۔؟

اگر منٹو کے افسانے ''کھول دو'' کو پڑھ کر کسی کے دل پر چوٹ نہ پڑے اور آنکھیں غم کے بوجھ سے بھیگنے کی بجائے سفلی جذبات بھڑک اٹھیں۔تو یہ عمل خود اس معاشرے کے چمکدار لباس کو تار تار کر دیتا ہے۔جس معاشرے کے خلاف منٹو بغاوت کر رہا تھا۔یہ حقیقت ہے کہ جب تہذیب کے علمبردار بھرے بازار میں خود کو عریاں محسوس کریں تو ان کا غصہ اتنا غیر مناسب بھی نہیں لگتا۔منٹو خود اس چیز کو محسوس کرتا تھا۔اس لیے وہ گالیاں دینے والوں کو برا بھلا نہیں کہتا۔اس نے اپنے افسانوں کے مجموعے ''منٹو کے افسانے'' کو خاص طور پر اخبار ''دین و دنیا'' دہلی کے نام سے منسوب کیا اور لکھا۔

''اخبار دین و دنیا کے نام جس میں میرے خلاف سب سے زیادہ گالیاں چھپیں۔'' (ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی. آج کا اردو ادب، صفحہ 274)

منٹو کے افسانوں کے بارے میں ایک بات اور قابل غور ہے اور وہ یہ کہ اس کے چند افسانے مثلاً دھواں، بلاؤز، پھاہا، ٹھنڈا گوشت، بو، سرکنڈوں کے پیچھے، کالی شلوار وغیرہ اتنے مشہور ہیں کہ اکثر ناقدین کے ہاں ان افسانوں پر شدید اعتراضات نظر آتے ہیں۔ ان کے سینکڑوں افسانوں میں سے صرف چند افسانوں پر اتنی بحث و تمحیص سے ذہن میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کیا چند افسانوں کی وجہ سے اُن سب افسانوں کو رد کیا جا سکتا ہے؟ یا پھر ان افسانوں میں بھی منٹو نے جو کچھ لکھا کیا واقعی وہ مریضانہ ہے؟ اس میں تلذذ موجود ہے۔۔۔؟ جیسا کہ عزیز احمد نے ترقی پسند ادب میں لکھا ہے۔

''منٹو کے ہاں جنس کا طلسم جس میں ان کا شعور اور لاشعور چاروں طرف گھرا ہوا ہے، حد درجہ مریضانہ ہے، جنس نے سعادت حسن منٹو کے ہاں مذہب کی جگہ لے لی ہے۔ جس مصنف کے ذہن پر جنس چھائی ہو۔ جنون بھی اس سے زیادہ دور نہیں رہتا۔ منٹو کا انقلابی ہیرو بھی بجائے اس کے سلجھے ہوئے عمل سے محنت اور کوشش سے تبلیغ سے ملک کو کوئی فائدہ پہنچائے بالعموم اپنے جوش جنون میں پاگل خانے یا مرگھٹ پہنچتا ہے۔ سب سے بڑا اعتراض منٹو پر یہ عائد ہوتا ہے۔ کہ اس میں انسانیت کا راسخ عقیدہ کہیں نظر نہیں آتا۔ (ترقی پسند ادب. سردار جعفری صفحہ210)

اس سے قبل کہ مندرجہ بالا سوالات کی روشنی میں منٹو کے بدنام افسانوں کا تجزیہ کیا جائے۔ عزیز احمد کی نئی اصلاح ''انسانیت کے راسخ عقیدہ'' کا تجزیہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ راسخ عقیدہ سے غالباً عزیز احمد کی یہی مراد ہے کہ انسانیت کا کوئی مثبت پہلو منٹو کے ہاں موجود نہیں۔۔۔۔۔۔ دراصل انسانیت کے منفی پہلو کو اجاگر کرنا خود ایک مثبت پہلو کی تلاش ہے۔ منٹو کے کسی افسانے میں جنسی پہلو کا کوئی غیر فطری انداز اس طرح اجاگر نہیں ہوتا کہ اس میں لطف کی کیفیت پیدا ہو۔ یا تلذذ پرستی کا احساس ابھرے۔ بلکہ ایسے افسانوں کو پڑھ کر کراہیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ کراہیت پیدا کرنا ہی منٹو کا مقصد ہے۔ منٹو کے اکثر افسانے انسان پر انسان کے ظلم کی داستان دہراتے نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔۔ وحشت اور بربریت کی یہ داستانیں بالعموم عورت اور جنسی موضوعات کے تحت ابھر کر سامنے آئی ہیں۔ جن افسانوں کا موضوع عورت اور جنس ہے ان کو اگر اس معنویت کے ساتھ پڑھا جائے جو افسانے میں اصل لفظوں کے پیچھے موجود ہے تو پھر پڑھنے والوں کو شاید وہ مریضانہ جنسی حیثیت کے حامل نظر نہ آئیں۔ ان کے ایسے افسانوں میں اس ظلم کے خلاف ایک احتجاج ہے جو

صدیوں سے عورت پر ڈھایا جاتا رہا۔ جہاں مرد نے ہمیشہ عورت کی جسمانی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی حیوانی خواہشات کی بھینٹ چڑھایا۔ عورت پر سب سے زیادہ ظلم سب سے زیادہ ناانصافی جنسی بنیادوں پر کی گئی۔ منٹو نے عورت اور جنس کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ کیونکہ اس موضوع کے علاوہ کسی دوسرے طریقے سے اس ظلم کا پردہ فاش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن منٹو کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ لوگوں نے اس میں بھی جنسی امراض جنسی تلذذ پرستی ہی محسوس کی اور اس دکھ تک ان کی رسائی نہ ہو پائی، جس دکھ کا اظہار منٹو کا مقصد تھا۔ دراصل منٹو ان مریضانہ ذہنوں کا علاج کرنا چاہتا تھا۔ جو بے جا دباؤ، خوف اور جنسی بھوک کی پیداوار تھے۔ لیکن یہ منٹو کا المیہ بن گیا کہ لوگوں نے خود منٹو کو جنسی مریض قرار دے کر اسے گالیاں دینی شروع کر دیں۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ لوگ جو منٹو کے افسانوں میں موجود انسانیت کی عریاں اور غلیظ تصویروں کو دیکھ کر منٹو کو گالیاں دینے لگتے ہیں۔ وہ حقیقت میں افسانوں کے موضوعات سے خفا ہوتے ہیں یا ان موضوعات کے زیر اثر انہیں اپنے شعور اور لاشعور کے درمیان حائل دیوار کے گرنے کا خوف منٹو پر غصہ دلاتا ہے۔ اس غصہ سے کبھی کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے لوگ زخم چھپا لینے کو زخم کا علاج سمجھتے ہیں۔ منٹو نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

''زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے واقف ہیں تو میرے افسانے پڑھئے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ناقابل برداشت ہے۔ میری تحریروں میں کوئی نقص نہیں جس کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔'' (**منٹو کے افسانے۔ پیش لفظ صفحہ۱۶، مکتبہ اردو، لاہور**)

منٹو کی یہ بات کس حد تک درست ہے۔ یہ میرے سامنے آج کا ''جنگ'' اخبار موجود ہے۔ ایک سرسری نظر میں چند سرخیاں ملاحظہ فرمایئے۔

''قتل کا بدلہ۔۔۔۔۔ میاں بیوی کا جھانسہ پونے دو لاکھ روپے ہتھیا لیے۔ اراضی کے تنازعہ پر چچا زاد بھائی اور بھتیجے کو زخمی کر دیا۔ قاتلانہ حملہ کے الزام میں تین سال قید کی سزا۔ ثریا دھوکہ کھا گئی۔ قتل کے جرم میں سزائے موت۔ بدچلنی کے شبہ میں شوہر بیوی کو قتل کر کے خود تھانے حاضر ہو گیا۔ اقدام قتل کی وارداتیں۔ نوجوان نے رسی مار کر خود کو زخمی کر لیا۔ چرس اور قمار بازی کے ملزم گرفتار۔ چودہ بچوں کی پچپن سالہ ماں اپنے نوکر کے ساتھ بھاگ گئی۔ پشاور شہر کے محلّہ شاہداد میں

ایک بیگ سے زندہ بچہ برآمد ہوا ہے۔ پولیس نے مقدمہ درج کر کے کنواری اور ظالم ماں کی تلاش شروع کر دی۔ سات سالہ لڑکا پراسرار طور پر لاپتہ ہو گیا۔ عورت پر دست درازی کرنے والا گرفتار۔ کلہاڑی سے حملہ کر کے زخمی کر دیا۔ بیوی کے آشنا کو چاقو کے پے در پے وار کر کے ہلاک کر دیا۔ ملنگ نے اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو ندی کے کنارے لے جا کر ذبح کر دیا۔ خاوند نے دوساتھیوں کی مدد سے بیوی کو ہلاک کر ڈالا۔ ملزم ایک کنواری لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔'' وغیرہ وغیرہ۔۔۔''

لیکن جب انہی موضوعات کو منٹو ان کے سیاسی، معاشرتی اور جنسی دباؤ کے پس منظر میں اپنے افسانوں میں پیش کرتا ہے تو لوگ اسے گالیاں دیتے ہیں۔

منٹو اس بات سے واقف تھا کہ انسانی نفس کی تہذیب کے لیے ضروری ہے کہ ظاہرداری جھوٹ اور پارسائی کے سیاہ برقعوں کو اتار کر انہیں ان کی اصل شکل دکھائی جائے۔۔۔۔۔۔۔ اور ساتھ ہی انہیں ذہنی طور پر اس سطح پر لایا جائے۔ جہاں وہ خود سے نہ صرف آگاہی حاصل کر سکیں، بلکہ وہ اپنی اصلی شخصیت اور جذبات پر پردہ ڈالنے کی کوشش بھی ترک کر دیں۔ تاکہ ان کے جذبات بگڑ کر تشدد یا کسی غیر فطری شکل میں نمودار نہ ہوں۔

''گویا منٹو نے جو کنواں کھودا تھا وہ ٹیڑھا بھینگا ہی سہی اور اس میں سے جو پانی نکلا گدلا یا کھاری سہی۔ مگر دو باتیں ایسی ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک تو یہ کہ منٹو نے کنواں کھودا ضرور، دوسرا یہ کہ اس میں سے پانی نکالا۔ اب ذرا گنئے تو سہی کہ اردو کے کتنے ادیبوں کے متعلق یہ دونوں باتیں کہی جا سکتی ہیں۔''

منٹو کے افسانوں میں بالعموم طوائف موجود ہے۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ موپساں کے افسانوں میں بھی طوائف بار بار ''جلوہ گر'' ہوتی ہے۔ منٹو نے ابتدا میں روسی افسانوں اور گورکی سے اثر لیا ہو۔۔۔۔۔۔۔ مگر بعد میں وہ کم و بیش اسی موضوع کر اپناتا ہے جو موپساں اور بعد میں سامرٹ ماہم کے یہاں ہمیں ملتا ہے۔ بعض لوگوں کو اس پر بھی اعتراض ہے کہ منٹو کے یہاں طوائف کا ذکر کیوں بار بار ملتا ہے لیکن اگر غور کیا جائے، تو منٹو کے ہاں یہ کردار معاشرے کی اہم ضرورت بن کر ابھرتا ہے۔ یہ کردار ایسے زہر کا تریاق ہے جو اگر ان کرداروں کی وساطت سے معاشرے کی رگوں سے کھینچا نہ جائے۔ تو یہ اکثر معصوم بچوں، کم سن دوشیزاؤں اور گھر کی پرسکون زندگی گزارنے والی خواتین کی رگوں میں سرایئت کر کے معاشرے میں انتشار، بے چینی اور بدامنی پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس احساس کا اظہار اس انتساب سے بھی ہوتا ہے جو منٹو نے اپنے مجموعے ''گنجے فرشتے'' میں غالب کے نام اس شعر سے کیا ہے۔

ہوس گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا

عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے

وہ اس ''عجب آرام'' کو تمام انسانوں تک پہنچانا چاہتا تھا تا کہ تنے ہوئے اعصاب اپنی فطری حالت میں آ کر آدمی کو صرف آدمی رہنے دیں۔ اس کا عقیدہ شاید یہ تھا کہ آدمی فرشتہ بننے کی کوشش میں بالعموم شیطان بن جاتا ہے اس لئے وہ آدمیوں کو فرشتہ بنانے کا قائل نہ تھا۔ منٹو نے اپنے مجموعے ''سیاہ حاشیے'' کو اس آدمی کے نام منسوب کیا۔

''جس نے اپنی خون ریزیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ''جب میں نے ایک بڑھیا کو مارا تو مجھے ایسا لگا مجھ سے قتل ہو گیا۔''

اس انتساب سے منٹو کے اس نازک احساس کا اندازہ ہوتا ہے جس کے تحت وہ لوگوں سے صرف اتنی خواہش کرتا تھا کہ لوگ جو کچھ ہیں، انہیں اس کا احساس ہو جائے۔

''انسان جیسا ہے ویسا ہی رہنا چاہیے۔ نیک کام کے لیے کیا ضروری ہے کہ انسان اپنا سر منڈائے، گیروے کپڑے پہنے یا بدن پر راکھ ملے۔ تم کہو گے یہ اس کی مرضی ہے لیکن میں کہتا ہوں اس کی اس مرضی ہی سے اس کی اس نرالی چیز ہی سے گمراہی پھیلتی ہے۔ یہ لوگ اونچے ہو کر انسان کی فطری کمزوریوں سے غافل ہو جاتے ہیں۔''

یہی سبب ہے کہ منٹو کے افسانوں میں ناصح، واعظ اور پارسا جیسے کردار ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔ اس نے احمد ندیم قاسمی کو ایک خط لکھا تھا۔

''کہ زندگی کو اس شکل میں پیش کرنا چاہیے۔ جیسی کہ وہ ہے، نہ کہ وہ جیسی تھی، یا جیسی ہو گی؟ یا جیسی ہونی چاہیے۔''

اس نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا تھا کہ ''نیک بیبیوں کی باتیں بہت ہو چکیں۔'' یہی سبب ہے کہ جب اس نے افسانے لکھے تو ان میں ایسے کردار پیش کیے جو پڑھنے والوں کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے پیچھے مقصد یہ تھا کہ ان بدخصلت کرداروں کو پڑھو، دیکھو اور سوچو کہ مجرم کون ہے؟ یہ کردار یا انہیں اس منزل پر پہنچانے والے پارسا۔''

(ڈاکٹر فردوس انور قاضی. اردو افسانہ کے رجحانات. صفحہ 308-303)

''منٹو کے افسانوں کے کردار زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں دلال ہیں، مولوی ہیں، استاد ہیں، پہلوان ہیں، کالج کے لڑکے لڑکیاں ہیں، قریب قریب ہر معاشرتی طبقے کے افراد منٹو کے افسانوں میں ملیں گے، لیکن ظاہر

ہے کہ جس معاشرت کو منٹو نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔اور جس کے افراد کم و بیش منٹو کے حمام میں سب ننگے ہیں وہ متوسط الحال طبقہ ہے جو غریبوں اور امیروں کے درمیان گھڑی کے پنڈولم کی طرح متحرک رہتا ہے۔اس طبقے میں سے کچھ اوپر کے طبقے میں چلے جاتے ہیں اور نو دولتیے کہلاتے ہیں۔کچھ نیچے اترتے ہیں اور اس قسم کے ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔مزدور، کسان، کلرک وغیرہ۔''

''منٹو اپنی ذات میں ایک مکمل نظام نسبتی تھا، اس لیے جہاں کہیں وہ نفسیاتی الجھن یا مرض کا ذکر کرتا ہے، نہایت ژرف نگاہی سے کرتا ہے۔جو عوارض اسے اپنی ذات میں نظر نہیں آتے انہیں وہ ناصحت مند کیفیات تصور کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ دل کے چور بڑی آسانی سے پکڑ لیتا ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ لکھتے وقت کوئی سماجی یا ثقافتی ممنوعات اس کے راستے میں کھڑی نہیں ہوتیں۔اس کے ھاں Taboos یعنی ممنوعات ذہنی بالکل نہیں ہیں۔پڑھنے والوں کی جھنجھلاہٹ اور پیچ و تاب کا اصل راز اسی خصوصیت میں مخفی ہے۔ان ممنوعات کو جب منٹو راستے سے ہٹاتا ہے تو جو لوگ ان کے سائے تلے یا ان کی دیوروں کے پیچھے چھپے ہوتے ہیں۔ان کو اپنی اس دنیا کے ستون لرزتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔چھتیں کانپتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔اور در و دیوار باہر کی طرف گر پڑتے ہیں۔اس طرح بعض لوگوں کو ننگے ہونے کا، بے آسرا ہونے کا احساس ہوتا ہے اور وہ منٹو کو گالیاں دے کر اپنی شکست خوردگی کی خفت مٹاتے ہیں۔تہذیب و تمدن، معاشرہ، ثقافت یا سماج، جو چاہے کہہ لیجئے، ان کے مفروضات، معتقدات، ظنیات اور توہمات کو منٹو از سرنو پرکھتا ہے۔اس طرح زندگی کی اقدار بھی پرکھی جاتی ہیں۔اور لوگ جو کچھ ظنیات اور ممنوعات کو ہی اقدار سمجھ کر تاریک حجروں میں میں رہتے ہیں۔ان کو میدان میں کھڑے ہو کر سورج کی روشنی میں اپنی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔یہ بڑا تکلیف دہ عمل ہے۔''

(پروفیسر سید عابد علی عابد. اصول انتقاد ادبیات . صفحہ 530-529)

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے منٹو کا نظریہ فن یوں بیان کیا کہ

''پتی ورتا استریوں اور نیک دل بیویوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔اب ایسی داستانیں فضول ہیں۔کیوں نہ ایسی عورت کا دل کھول کر بتایا جائے جو اپنے پتی کی آغوش سے نکل کر دوسرے مرد کی بغل گرما رہی ہو۔اور اس کا پتی کمرے میں بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا ہو، گویا کچھ ہو ہی نہیں رہا۔زندگی کو اس شکل میں پیش کرنا چاہیے۔**(منٹو کے خطوط ندیم کے نام . احمد ندیم قاسمی)**

منٹو نے عورت کے بارے میں ایسا کیوں سوچا؟

''خالص نوری فرشتے کا منٹو کے ہاں گزر نہیں۔ خالص معصوم نوری فرشتے سے جس سے گناہ ہونے کا امکان ہی نہیں، فنکار منٹو کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ وہ آدم کی جرأتِ گناہ کا قائل ہے۔ منٹو کا انسان نوری ہے نہ ناری۔ منٹو کا انسان آدم خاکی ہے۔ وہ وجود خاکی جس نے بنیادی گناہ، فساد، قتل وخون وغیرہ کا امکان ہونے کے باوجود جس کے سامنے خدا نے نوری فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا۔'' (ممتاز شیریں . منٹو نوری نہ ناری. صفحہ 60)

منٹو کے نزدیک!

''عورت اپنی فطرت میں مرد کے لیے ترغیب اور بربادی کا سامان ہو تو ہو، سماج میں اس کی حیثیت ایک مجبور اور بے بس ہستی کی رہی ہے۔ اور پھر بنیادی طور پر عورت کی سرشت میں بدی ہی بدی نہیں ہے۔ عورت بھی مرد کی طرح بلکہ مرد سے کہیں زیادہ اپنی فطرت میں پیچیدہ ہے۔ معصیت اور معصومیت، نیکی اور بدی، قوت اور کمزوری، بلندی اور پستی کا مجموعہ'' (ممتاز شیریں . منٹو نوری نہ ناری. صفحہ 64)

منٹو نے اپنے عہد میں سے، اپنے مشاہدے کے فوکس سے جس عورت کو پیش کیا ہے وہ عورت ۔۔! مرد کے سماج میں رہنے والی مجبور، مظلوم اور بے بس عورت ہے ۔ اس نے عورت کو جس روپ میں دیکھا ۔ منٹو کے نسوانی کردار ۔۔۔۔! منٹو کے عہد کی المیاتی تصویریں ہیں۔ جس میں حقیقت نگاری کے ساتھ تخلیقی رنگ آمیزی اس خوبصورتی سے کی گئی ہے کہ منٹو کے یہ نسوانی کردار امر ہو گئے۔

منٹو کے افسانوں سے جھانکتے ہوئے نسوانی کردار، عورت کی تقریباً تمام سطحوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن میں عورت ذات کی حیثیت، رتبے، احساسات، رویے، جذبات اور ذہنی کیفیات نے عورت کے فطری پن کو اپنے المیاتی احساس کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

منٹو کے نسوانی کردار ایک آئینہ ہی ہیں اور ایک سوال بھی۔ کہ ایک عہد گزر جانے کے باوجود جس میں دنیا عالمی گاؤں کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ کیا آج بھی عورت کا المیہ وہی ہے جو منٹو کے عہد میں تھا؟

امجد جاوید



ممی

مسز سٹیلا جیکسن ۔۔۔۔۔۔! ایک عیسائی عورت ۔ جو اپنی بیوگی کے باوجود مسرور مطمئن تھی ۔اس کا خاوند پہلی جنگ عظیم میں مارا گیا تھا۔ وہ پونا کب آئی، اس بابت معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی ۔ وہ بڑی بھر پور عورت تھی جس کی بنیاد اس کی ذاتی خصوصیات تھیں ۔

''دراصل میں نے اس کے محل وقوع کے متعلق کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی ۔ وہ اتنی دلچسپ عورت تھی کہ اس سے مل کر سوائے اس کی ذات سے اور کسی سے دلچسپی نہیں رہتی ہے۔ اس کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی ۔ اس لیے کہ وہ پونا کے ہر ذرے سے وابستہ تھی ۔ ہوسکتا ہے یہ ایک حد تک مبالغہ ہو۔ مگر پونا میرے لیے وہی پونا ہے اور اس کے وہی ذرے، اس کے تمام ذرے ہیں جن کے ساتھ میری چند یادیں منسلک ہیں ۔ اور ممی کی عجیب وغریب شخصیت ان میں سے ہر ایک میں موجود ہے۔''

ممی اپنی یادگار شخصیت کے باوجود اپنے میک اپ کے باعث بے حد کوفت کا باعث بن جاتی تھی ۔

''میں چونک پڑا۔ چڈہ تھا۔ ایک گھسی ہوئی میم کے ساتھ ۔ دونوں ساتھ ساتھ جڑ کے بیٹھے تھے ۔ میرا پہلا ردعمل انتہائی افسوس ناک تھا کہ چڈہ کی جمالیاتی حس کہاں گئی جو ایسی لال لگامی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ عمر کا ٹھیک اندازہ تو میں نے اس وقت نہیں کیا تھا۔ مگر اس عورت کی جُھریاں پاؤڈر اور رُوج کی تہوں میں سے بھی صاف نظر آرہی تھیں ۔ اتنا شوخ میک اپ تھا کہ بصارت کو سخت کوفت ہوتی تھی ۔''

ممی کا میک اپ ہی ایسا سائن بورڈ تھا جو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتا تھا۔

''یہ بھی ایک کاٹیج تھی ۔ شکل وصورت اور ساخت کے اعتبار سے سعیدہ کاٹیج جیسی مگر صاف ستھری ۔ جس سے ممی کے سلیقے اور قرینے کا پتہ چلتا تھا۔ فرنیچر معمولی تھا مگر جو چیز جہاں تھی، سجی ہوئی تھی ۔ پر بھارت نگر سے چلتے وقت میں نے سوچا تھا کوئی فحبہ خانہ ہوگا۔ مگر اس گھر کی کسی چیز سے بھی بصارت کو ایسا شک نہیں ہوتا تھا وہ ایسا ہی شریفانہ تھا جیسا کہ ایک اوسط

درجے کے عیسائی کا ہوتا ہے۔لیکن ممی کی عمر کے مقابلے میں وہ جوان جوان دکھائی دیتا تھا۔اس پر وہ میک اپ نہیں تھا جو میں نے ممی کے جھریوں والے چہرے پر دیکھا تھا۔ جب ممی ڈرائینگ روم میں آئی،تو میں نے سوچا کہ گردوپیش کی جتنی چیزیں ہیں وہ آج کی نہیں ہیں، بہت برسوں کی ہیں۔صرف ممی آگے نکل کر بوڑھی ہوگئی ہے اور وہ ویسی کی ویسی پڑی رہی ہیں۔ان کی جو عمر تھی۔وہ وہیں کی وہیں رہی ہے۔لیکن جب میں اس کے گہرے اور شوخ میک اپ کی طرف دیکھتا تو نہ جانے کیوں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ وہ بھی اپنے گردوپیش کے ماحول کی طرح سنجیدہ و متین طور پر جوان بن جائے۔''

''لیکن یہ چیز مجھے بار بار ستا رہی تھی کہ وہ اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے جو اس کی جھریوں کی توہین ہے۔اس ممتا کی تضحیک ہے جو اس کے دل میں چڈے،غریب نواز اور ون کترے کے لیے موجود ہے۔اور خدا معلوم اور کس کس کے لیے۔۔۔۔۔''

افسانے کے ایک مقام پر منٹو باتوں ہی باتوں میں چڈہ سے ایک سوال پوچھتا ہے۔

''یار یہ تو بتاؤ تمہاری ممی اتنا شوخ میک کیوں کرتی ہے؟'' جواباً اسے چڈہ کہتا ہے۔

''اس لیے کہ دنیا ہر شوخ چیز کو پسند کرتی ہے۔۔۔۔۔تمہارے اور میرے جیسے الو اس دنیا میں بہت کم بستے ہیں جو مدہم سر اور مدہم رنگ پسند کرتے ہیں جو جوانی کو بچپن کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے اور۔۔۔۔۔اور جو بڑھاپے پر جوانی کا ملمع پسند نہیں کرتے۔ہم جو خود کو آرٹسٹ کہتے ہیں۔۔۔۔۔اُلو کے پٹھے ہیں۔''

منٹو۔۔۔۔۔! ممی کی شخصیت میں اس کے میک اپ سے داخل ہوتا ہے جیسے کہ یہ واہیات میک اپ ممی کی ذات کا دروازہ ہو۔منٹو کے سامنے ممی کی شخصیت واضح ہوتی ہے مگر وہ اس کے میک اپ کو نہیں بھولتا۔

''میں نے ممی کی طرف دیکھا جو بہت ہشاش بشاش جوان لڑکیوں میں گھلی ملی چڈے کے ننگے ننگے لمرک سن کر ہنس رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی۔اس کے چہرے پر وہی واہیات میک اپ تھا۔اس کے نیچے اس کی جھریاں صاف نظر آرہی تھیں۔مگر وہ بھی مسرور تھیں۔میں نے سوچا۔آخر لوگ کیوں فرار کو برا سمجھتے ہیں۔وہ فرار جو میری آنکھوں کے سامنے تھی۔اس کا ظاہر گو بدنما تھا لیکن باطن اس کا بے حد خوبصورت تھا۔اس پر کوئی بناؤ سنگھار،کوئی غازہ،کوئی ابٹنا نہیں تھا۔''

''اس تصویر میں کون سا رنگ،کون سا خط غلط تھا؟۔۔۔۔۔ممی کا وہ بھڑکیلا اور شوخ میک اپ بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس تصویر کا ایک لازمی جز ہے۔''

ممی ایک ادھیڑ عمر عورت تھی لیکن اپنے بھڑ کیلے لباس، شوخ اداؤں اور واہیات میک اپ کے باعث قحبہ عورت دکھائی دیتی تھی لیکن واہیات میک اپ کی تہوں میں جو ممتا تھی وہ نہایت غور سے دیکھنے کے بعد ہی پتہ چلتا تھا۔

''ممی سب کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔ اس کے پہلو میں ایسا دل تھا جس میں ان سب کے لیے ممتا تھی۔ میں نے سوچا شاید اس لیے اس نے اپنے چہرے پر رنگ مل لیا ہے کہ لوگوں کو اس کی اصلیت معلوم نہ ہو۔ اس میں شاید جسمانی قوت نہیں تھی کہ وہ ہر ایک کی ماں بن سکتی۔ اس نے اپنی شفقت اور محبت کے لیے چند آدمی چن لیے تھے اور باقی ساری دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔''

ممی وہی ممی تھی۔ پولی کی ممی، ڈولی کی ممی، چڈے کی ممی، رنجیت کی ممی۔ سوڈے کی بوتلوں، گزک کی چیزوں اور محفل جمانے کے لیے دوسرے ساز و سامان کے انتظام میں وہ اسی پر شفقت انہاک میں حصہ لیتی تھی۔ اس کے چہرہ کا میک اپ ویسا ہی واہیات ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے اسی طرح کے شوخ و شنگ تھے۔ غازے اور سرخی کی تہوں سے اس کی جھریاں اسی طرح جھانکتی تھیں مگر اب مجھے یہ مقدس دکھائی دیتی تھیں۔ اتنی مقدس کہ پلیگ کے کیڑے ان تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ڈر کر، سمٹ کر، وہ دوڑ گئے تھے۔ چڈے کے جسم سے بھی نکل بھاگے تھے کہ اس پر ان جھریوں کا سایہ تھا۔۔۔۔ ان مقدس جھریوں کا جو ہر وقت نہایت واہیات میک اپ میں لتھڑی رہتی تھیں۔''

ممی نے اپنی شفقت اور محبت کے لیے جن چند لوگوں کو چنا تھا ان میں چڈہ بھی تھا جسے ممی ''میرا نا قابل اصلاح لڑکا'' گردانتی تھی۔

اسے ممی کے ہاں آئی لڑکی فی لس پسند آجاتی ہے اور اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ جس پر ممی فی لس کا خیال کرتے ہوئے چڈہ کو منع کر دیتی ہے۔ وہ بھڑک جاتا ہے اور ممی سے بدزبانی پر اتر آتا ہے۔

''تم دیوانی ہو گئی ہو۔۔۔۔ بوڑھی دلالہ۔۔۔۔ فی لس میری ہے۔ پوچھ اس سے۔۔۔۔''

ممی نے بہت دیر تک اس کی گالیاں سنیں۔ آخر میں بڑے سمجھانے والے انداز میں اس سے کہا ''چڈہ۔ مائی سن۔۔۔۔ تم کیوں نہیں سمجھتے۔۔۔۔ شی از ینگ۔ شی از ویری ینگ۔''

چڈہ نہیں مانتا۔ زبردستی کرتا ہے جس پر وہ ممی سے تھپڑ کھا لیتا ہے۔ وہی چڈہ۔۔۔۔! ایک خطرناک بیماری پیگ کا شکار ہو جاتا ہے۔ تب ممی ہی اس کی بیماری کی اطلاع سے لے کر صحت یابی تک اس کی خدمت کرتی ہے۔ بے آرام ہوتی

ہے، ہسپتال سے دوائیاں لاتی ہے اور اسے اپنی سہیلی کے ہاں پہاڑی مقام پر بھیجتی ہے۔ جس پر وہی چڈہ اپنی غلطی کا نہ صرف احساس کرتا ہے بلکہ اس کی نظر میں ممی کی قدر و منزلت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اسے ان الفاظ سے یاد کرتا ہے۔

''اس جھوٹے زمانے میں یہ صداقت کی حیرت انگیز فتح ہے اور اس کا سہرا میری بڈھی کے سر ہے۔''

''وہ لاجواب عورت ہے۔۔۔۔۔خدا کی قسم وہ لاجواب عورت ہے۔۔۔۔۔دعا کرو کہ تم بھی اس کی عمر کو پہنچ کر اس کی طرح گریٹ ہو جاؤ۔''

ممی کے اردگرد بہت سارے لوگ تھے۔ رنجیت کمار۔ غریب نواز۔ چڈہ۔ ون کترے، اینما۔ تھیلما، کٹی اور سعیدہ کاٹیج کے دوسرے لوگ۔ مگر۔۔۔۔!

''اس کی نگاہ سب پر تھی۔ اس بلی کی طرح جو بظاہر آنکھیں بند کیے سستاتی ہے مگر اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پانچوں بچے کہاں کہاں اور کیا کیا شرارت کر رہے ہیں۔''

''ممی کے گھر میں محفلوں کی پرخلوص گرمی لیے ہوئے میں واپس بمبئی چلا گیا۔ ان محفلوں میں رندی تھی۔ بہت خوش تھی۔ جنسیاتی رنگ تھا مگر کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ ہر چیز حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح قابل فہم تھی، اسی طرح ابھری ہوئی بظاہر اسی طرح کڈھب، بینڈی اور دیکھنے والے کو گومگو کی حالت میں ڈالنے والی۔ مگر اصل میں بڑی صحیح، باسلیقہ اور اپنی جگہ پر قائم۔''

ممی پورے خلوص سے دوسروں کی مدد کرتی رہی۔ ''ون کترے کی خوبصورت بیوی کے جب اسقاط ہوا تھا تو ممی ہی کی بروقت امداد سے اس کی جان بچی تھی۔ تھیلما جب ہندوستانی رقص سیکھنے کے شوق میں مارواڑ کے ایک کھتک کے ہتھے چڑھ گئی تھی اور اس سودے میں ایک روز جب اس کو اچانک معلوم ہوا تھا کہ اس نے ایک مرض خرید لیا ہے تو ممی نے اس کو بہت ڈانٹا۔۔۔۔۔اس نے اسی شام اپنے بیٹوں کو ساری بات سنا دی اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ تھیلما کا علاج کرائیں، کٹی کو ایک معمہ حل کرنے کے سلسلے میں پانچ سو روپے کا انعام ملا تو اس نے مجبور کیا تھا کہ وہ کم از کم اس کے آدھے روپے غریب نواز کو اس دے دے کیونکہ اس غریب کا ہاتھ تنگ ہے۔۔۔۔۔'' پھر ممی کو پونا چھوڑنا پڑا۔ اس کی وجہ جب پوچھی گئی تو چڈہ نے تلخی سے کہا۔

''حکومت کو اس کی ادائیں پسند نہیں تھیں۔ اس کی وضع قطع پسند نہیں تھی۔ اس کے گھر کی محفلیں اس کی نظر میں قابل

اعتراض تھیں۔اس لیے کہ پولیس اس کی شفقت اور محبت بطور یرغمال کے لینا چاہتی تھی ۔۔۔۔۔وہ اسے ماں کہہ کر ایک دلالہ کا کام لینا چاہتے تھے۔۔۔۔۔ایک طرح سے اس کا ایک کیس زیر تفتیش تھا۔آخر حکومت کی تحقیقات سے مطمئن ہوگئی اور اس کوتڑی پار کردیا۔۔۔۔۔شہر بدر کردیا۔وہ اگر قحبہ تھی،۔۔۔۔۔دلالہ تھی۔۔۔۔۔اس کا وجود سوسائٹی کے لیے مہلک تھا تو اس کا خاتمہ کردینا چاہئے تھا۔پونے کی غلاظت سے یہ کیوں کہا گیا کہ تم جہاں چاہو ڈھیر ہوسکتی ہو۔''

چڈہ نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور تھوڑی دیر خاموش رہا پھر اس نے بڑے جذبات بھرے لہجے میں کہا۔''مجھے افسوس ہے منٹو کہ اس غلاظت کے ساتھ ایک ایسی پاکیزگی چلی گئی ہے جس نے اس رات میری ایک بڑی غلط اور نجس ترنگ کو میرے دل ودماغ سے دھوڈالا لیکن مجھے افسوس نہیں ہونا چاہیے۔۔۔۔۔وہ پونے سے چلی گئی ہے۔مجھ ایسے جوانوں میں ایسی نجس اور غلط ترنگیں وہاں بھی پیدا ہوں گی جہاں وہ اپنا گھر بنائے گی ۔ میں اپنی ممی ان کے سپرد کرتا ہوں۔زندہ باد ممی ۔۔۔۔زندہ باد۔۔۔۔۔''

''میں نے اپنی بیوی سے اس کا ذکر خلاف معمول بڑے جذباتی انداز میں کیا تو اس نے متاثر ہوکر صرف اتنا کہا کہ ایسی عورتیں عموماً خدمت گزار ہوتی ہیں۔'' (مجموعہ:یزید۔۔۔افسانہ۔ممی)



سلطانہ

سلطانہ۔۔۔۔! ابنالہ چھاؤنی میں دھندہ کرنے والی ایک معمولی طوائف،جس کے زیادہ تر گاہک گورے تھے، اسے گوروں کی زبان نہیں آتی تھی تاہم ان گوروں سے اس نے دس بارہ انگریزی کے جملے سیکھ لئے تھے۔اس کے گاہک ''صرف'' گاہک'' تھے۔سلطانہ ان سے کوئی جذباتی وابستگی نہیں رکھتی تھی۔ہاں جب کبھی کوئی چھیڑ چھاڑ زیادہ کرتا تب وہ گالی بک دیا کرتی تھی۔

''صاحب۔۔۔۔۔!تم ایک دم الو کا پٹھا ہے،حرام زادہ ہے۔۔۔۔۔!سمجھا!''یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجے میں سختی

پیدا نہ کرتی بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی۔''

ابنالے میں اس کا اچھا بھلا کاروبار تھا۔''تین چار گھنٹوں میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔''

''سلطانہ نے کانوں کے لیے بندے خریدے۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوائیں۔ دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کر لیں۔ گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آ گیا۔ قصہ مختصر کہ ابنالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی۔''

سلطانہ ایک ضعیف الاعتقاد عورت تھی۔

''خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کاروبار چمک اٹھا۔ عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی، اس لیے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے۔ جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔''

ابنالہ سے دہلی میں آنے کی جہاں اور وجوہات تھیں وہاں سرفہرست یہی بات تھی۔

''مگر ایکا ایکی جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سلطانہ انکار کیسے کرتی جبکہ خدا بخش کو اپنے لیے مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کر لیا۔''

دہلی آ جانے کے بعد اس کا کاروبار تقریباً چلا ہی نہیں، بالکل ٹھپ ہو جانے کی طرح۔ تین ماہ میں صرف چھ گاہک جس سے اس کی آمدن ساڑھے اٹھارہ روپے ہوئی تھی۔

''ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں۔۔۔۔۔ بیس روپے ماہوار تو اس کوٹھے کا کرایہ تھا۔ جس کو مالک مکان انگریزی میں فلیٹ کہتا تھا۔''

یوں اسے دہلی آ کے مایوسی ہوئی۔ وہ خالص کاروباری انداز میں سوچتی اور اس کا اظہار بھی کرتی۔''دکان کھولتے ہی گاہک تھوڑی آ جاتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی۔''

''کیا بات ہے خدا بخش، پورے دو ماہ ہو گئے ہمیں یہاں آئے ہوئے کسی نے ادھر کا رخ ہی نہیں کیا۔ مانتی ہوں آج کل بازار میں بہت مندا ہے۔ پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی نہ آئے۔''

''تم میری سنو، اور چلو واپس ابنالے۔۔۔۔۔ یہاں کیا دھرا ہے۔۔۔۔۔ بھئی ہوگا۔ پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا۔

تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا۔ چلو، وہیں چلتے ہیں۔ جو نقصان ہوا اس کو اپنا سر صدقہ سمجھ۔ اس کنگنی کو بیچ آؤ۔ میں اسباب باندھ کر تیار رکھتی ہوں آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے۔''

سلطانہ ایک عام انسان کی طرح اپنی انتہائی بنیادی ضرورتوں کے بارے میں ہی سوچتی اور پریشان بھی ہوتی۔

''بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرائے میں چلے جاتے تھے۔ پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ، کھانا پینا، کپڑے لتے، دوا دارو اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین ماہ میں آئے تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے سلطانہ پریشان ہو گئی۔''

''سلطانہ چپ ہو گئی چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اتر گئی۔ بُچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ پر کیا کرتی، پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔ جب پانچ مہینے گذر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔''

سلطانہ ایک سیدھی سادی عورت بھی ہے۔ وہ یوں کہ

''چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی تھیں، اس لیے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوتی تھی۔ پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگایا تو اس کو ایک پکی نشانی مل گئی۔'' یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے۔'' یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔۔۔۔۔''

سلطانہ انتہائی مایوسی اور تنہائی میں اپنی ذات کا موازنہ بے جان چیزوں سے کرتی۔

''سڑک کے دوسری طرف مال گودام تھا۔ جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی تھیں اور ہر قسم کے مال و اسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا۔ جس میں بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوتی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح ابھری ہوتیں تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں۔ کبھی اِدھر، کبھی اُدھر، ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک، پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکنی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا اور گلابی آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بادل بھی ایک شور

کے ساتھ پٹڑیوں سے اٹھتے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو، اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے، دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔۔۔۔ نہ جانے کہاں پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ کہیں رک جائے گی۔ کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا۔''

''اب تو کبھی اسکے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹڑیوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اٹھ رہا ہے، ایک بہت بڑا چکلا ہے۔ بہت سی گاڑیاں جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر ادھر دھکیلتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے جو کبھی کبھی ابنالہ میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گذرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر، کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے، چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکنی میں جانا چھوڑ دیا۔''

سلطانہ اپنے پیشے کے بارے میں مخلص تو ہے تاہم پھر بھی وہ اسے اچھا نہیں گردانتی کہ اس پر فخر کر سکے اس کا پیشہ اس کے نزدیک برا نہ ہی مگر وہ اچھا بھی نہیں سمجھتی۔ مثلاً جب شنکر اس سے پوچھتا ہے کہ تم کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہوگی۔'' اس کے جواب میں وہ کہہ دیتی تھی۔ ''جھک مارتی ہوں۔''

سلطانہ عام لوگوں کی طرح ڈیپریسڈ بھی ہوتی ہے اور لاشعوری طور پر اس کا مداوا بھی کر لیتی وہ خدا بخش سے ضد کرتی ہے۔

''شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس آدمی کی باتوں نے اس کے دکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ ابنالہ میں آیا ہوتا جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا ہوتا۔ مگر یہاں چونکہ وہ بہت اداس رہتی تھی۔ اس لیے شنکر کی باتیں اسے پسند آئیں۔''

سلطانہ عام طوائفوں کی طرح اپنے پیشے کی باتیں کرتی ہے اور اپنی اوقات جانتی تھی۔ اس بابت شنکر ایسی بات کرتا

جسے وہ بغیر کچھ کہے قبول کر لیتی۔

''تم غلط کہتی ہو۔۔۔۔۔اسی محلے میں تمہیں سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی۔ جو کبھی یقین نہیں کریں گے کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے۔ جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی ہو۔لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو۔تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟''

سلطانہ عام عورتوں کی طرح اپنی ایک معمولی سی خواہش پر اڑ جاتی ہے جو پوری ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔''تم خدا کے لیے کچھ کرو! چوری کرو یا ڈاکہ ڈالو، پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو۔ میرے پاس سفید بوسکی کی قمیض پڑی ہے اس کو میں رنگوا لوں گی۔سفید نینوں کا ایک نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے، وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لا کر دیا تھا، یہ بھی قمیض کے ساتھ رنگوا لیا جائے گا۔ایک صرف شلوار کی کسر ہے۔سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کرو۔ دیکھو، تمہیں میری جان کی قسم، کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو۔۔۔۔۔میری بھتی کھاؤ، اگر نہ لاؤ!''

خدا بخش سے اپنی خواہش پوری ہوتے نہ دیکھ کر وہ شنکر سے کہتی ہے۔

''جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا۔''شنکر میری بات مانو گے؟''

شنکر نے جواباً کہا؛''پہلے بات بتاؤ۔''

''سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی۔''تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر۔۔۔۔۔''

''کہو کہو۔۔۔۔۔رک کیوں گئی ہو۔''

''سلطانہ نے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔''بات یہ ہے کہ محرم آ رہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں۔۔۔۔۔یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔قمیض اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا۔ جو میں نے آج رنگوانے کے لیے دے دیا ہے۔''

''شنکر نے یہ سن کر کہا''تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم یہ کالی شلوار بنوا سکو۔''

''سلطانہ نے فوراً کہا''نہیں' میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار لا دو۔''

سلطانہ ایک عام سی طوائف، عام سی خواہشوں اور سوچ رکھنے والی جب منٹو کے افسانہ کالی شلوار میں آتی ہے تو ایک دم خصوصیت حاصل کر کے جیتا جاگتا کردار بن جاتی ہے۔منٹو اپنے اسی کردار کے بارے میں یوں کہتا ہے۔'' یہ لاش گلی

سڑی، بدبودار سہی، متعفن سہی، بھیانک سہی، گھناؤنی سہی، لیکن اس کا منہ دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ کیا یہ ہماری کچھ نہیں لگتی۔ کیا ہم اس کے عزیز و اقارب نہیں۔ ہم کبھی کفن ہٹا کر اس کا منہ دیکھتے رہیں گے اور دوسروں کو دکھاتے رہیں گے۔''

''میری سلطانہ عورت بعد میں ہے۔ ویشیا سب سے پہلے ہے۔ کیونکہ انسان کی زندگی میں اس کا پیٹ سب سے زیادہ اہم ہے،'' شنکر اس سے پوچھتا ہے۔ ''تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہوگی؟''

سلطانہ جواب دیتی ہے ''جھک مارتی ہوں۔''۔۔۔۔۔۔۔ وہ یہ نہیں کہتی کہ میں گندم کا بیوپار کرتی ہوں یا سونے چاندی کی تجارت کرتی ہوں۔ اسے معلوم ہے وہ کیا کرتی ہے۔ اگر کسی ٹائپسٹ سے پوچھا جائے کہ تم کیا کام کرتے ہو تو وہ یہی جواب دے گا۔ ''ٹائپ کرتا ہوں۔''

میری سلطانہ اور ایک ٹائپسٹ میں کیا فرق ہے۔۔۔۔۔ غور کیجئے!

(منٹو۔ سفید جھوٹ از لذت سنگ)

❁

نِکّی

نکی ایک جھگڑالو خاتون، جو باقاعدہ فیس لے کر جھگڑا کرتی ہے۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی بھی وکیل اپنے کسی مؤکل کے لیے فیس لے کر عدالت میں مقدمہ لڑنے کے لیے حاضر ہوتا ہے۔ نکی جس محلے میں رہتی ہے۔ اس کے مؤکل بھی اسی محلے میں رہائش پذیر ہیں۔ جو ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی غرض سے نکی کو ''ہائیر'' کرتے ہیں۔ تاکہ وہ ان کی طرف سے جھگڑا کرے۔

نکی کے لیے ایسا ''پیشہ'' اپنانا مجبوری تھا۔ اور مجبوری ہمیشہ چند وجوہات لیے ہوئے ہوتی ہے۔ نکی کی مجبوریاں کچھ اس طرح کی تھیں۔

''نکی ایک طلاق یافتہ عورت ہے۔اس کا شوہر'' گام'' پرلے درجے کا نکھٹو اور شرابی کبابی، بھنگ چرس کی بھی لت تھی۔کئی کئی دن تک بھنگر خانوں اور تکیوں پر پڑا رہتا تھا۔مار پیٹ کے علاوہ گالیاں دینا اور گھر سے نکال دینے کے علاوہ نکی کی محنت مزدوری سے جو تھوڑی بہت رقم جمع ہوتی تھی وہ بھی اڑا لیتا تھا۔''

نکی اپنے شوہر کے ہاں بے اہمیت بیوی ہونے کے باوجود سارے ظلم وستم برداشت کرتی رہی تھی۔یہ اس لیے بھی تھا کہ نکی کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اور نہ کوئی اس کا پرسان حال تھا۔شادی کے دس سال بعد بھی وہ اس لیے بھی طلاق لینے پر رضا مند ہوگئی کہ

''لڑائی جھگڑے کا آغاز تو پہلے دن ہی ہوگیا تھا۔جب نکی دلہن بن کر گام کے گھر گئی تھی۔لیکن طلاق کا سوال اس وقت پیدا ہوا تھا جب وہ گام کے لیے دعائیں مانگ مانگ کر عاجز آگئی تھی۔اور اس کے ہاتھ اپنی یا اس کی موت کے لیے اٹھنے لگے تھے۔جب یہ حیلہ بھی بے اثر ثابت ہوا تو اس نے اپنے شوہر کی منت سماجت شروع کر دی کہ وہ اسے بخش دے اور علیحدہ کر دے۔مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ دس برس کے بعد تکیے میں ایک ادھیڑ عمر کی میراثن سے گام کی آنکھ لڑی اور ایک دن اس کے کہنے پر اس نے نکی کو طلاق دے دی۔''

یوں طلاق حاصل کر کے نکی نچنت (مطمئن۔بےفکر) ہوگئی۔

نکی کا جھگڑے کرنے والا پیشہ اپنانے کی دوسری وجہ اس کا محلّہ پر دھاک بٹھانے کے علاوہ اپنے اندر کی بھڑاس نکالنا بھی مقصد تھا۔

''اس کے دس برس اداس خاموشی میں گذرے تھے۔دل میں ہر روز اس کے بڑے بڑے طوفان جمع ہوتے تھے۔مگر وہ خاوند کے سامنے اف تک نہیں کر سکتی تھی۔اس لیے کہ اسے بچپن ہی سے یہ تعلیم ملی تھی کہ شوہر کے سامنے بولنا ایسا گناہ ہے جو کبھی بخشا نہیں جاتا۔اب وہ آزاد تھی۔اس لیے وہ چاہتی تھی کہ اپنے دس برس کی بھڑاس کسی نہ کسی طرح نکالے۔چنانچہ ہمسائیوں سے اس کی اکثر لڑائی بھڑائی ہونے لگی۔معمولی توں توں میں میں گالیوں کی جنگ میں تبدیل ہوجاتی۔نکی پہلے جس قدر خاموش تھی۔اب اسی قدر اس کی زبان چلتی تھی۔فٹافٹی میں وہ اپنے مدمقابل کی ساتوں پیڑھیاں پن کر رکھ دیتی۔ایسی ایسی گالیاں اور سٹھنیاں دیتی کہ اس کے چھکے چھوٹ جاتے۔''

یوں'' آہستہ آہستہ سارے محلے پر نکی کی دھاک بیٹھ گئی۔''

نکی کا جھگڑے والا پیشہ اپنانے کی تیسری وجہ اس کی بیٹی ''بھولی'' تھی۔ بھولی گیارہ سال کی تھی جو سرعت سے جوان ہو رہی تھی۔ نکی، اپنی بیٹی بھولی کا جہیز تیار کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اس کا اپنا زیور گام نے بیچ کھایا تھا۔ معمولی محنت مزدوری جو چرخہ کاتنے، گڈے گڑیاں بنا کر یا اس طرح کے چھوٹے چھوٹے کام سے بمشکل گزر اوقات ہی ہوتی تھی۔ لڑائی جھگڑے کا پیشہ اپنانے سے اسے خاطر خواہ فائدہ ہوا۔

''نکی اب فارغ البال تھی۔ ہر مہینے اسے اب اتنی آمدن ہونے لگی کہ اس نے پس انداز کر کے اپنی بیٹی بھولی کا جہیز بنانا شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اتنے گہنے پاتے اور کپڑے لتے ہو گئے تھے۔ کہ وہ کسی بھی وقت اپنی بیٹی کی ڈولی میں ڈال سکتی تھی۔''

نکی کا لڑائی جھگڑے کا پیشہ اپنانے کی چوتھی وجہ اس کا اپنا ذریعہ آمدن تھا۔

''لیکن جب نکی نے دیکھا کہ ہر دوسرے تیسرے دن اسے محلے کی کسی نہ کسی عورت کی لڑائی میں شریک ہونا پڑتا ہے اور اس کے کام کاج کا ہرج ہوتا ہے۔ تو اس نے پہلے دبی زبان سے، پھر کھلے لفظوں میں اپنا معاوضہ مانگنا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ اپنی فیس بھی مقرر کر لی۔ معرکے کی جنگ ہوتی تو پچیس روپے، دن زیادہ لگیں تو چالیس، معمولی چخ کے صرف چار روپے اور دو وقت کا کھانا۔ درمیانے درجے کی لڑائی کے پندرہ روپے، کسی کی سفارش ہو تو وہ کچھ رعایت بھی کر دیتی تھی۔''

''بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ آج وہ جنتے کے لیے خیراں سے لڑی ہے تو ڈھائی مہینے کے بعد اسی خیراں سے ڈبل فیس لے کر اسے جنتے سے لڑنا پڑتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ گھبراتی نہیں تھی۔ اسے اپنے فن میں اتنی مہارت ہو گئی تھی کہ اس کی پریکٹس میں وہ اتنی مخلص تھی کہ اگر کوئی فیس دیتا تو وہ اپنی بھی دھجیاں بکھیر دیتی۔''

نکی نے دوسروں کی طرف سے لڑائی جھگڑا کرنے کا پیشہ تو اپنا لیا تھا اور اس سے وہ مطمئن اور بے فکر بھی تھی تاہم اسے اس وقت سب کچھ بھول گیا جب اسے اپنی بیٹی بھولی کے لیے رشتہ ملنے میں مایوسی ہو گئی۔ کیونکہ ''شروع شروع میں تو اس کو کوئی اتنی جلدی نہیں تھی مگر جب بھولی سولہ برس کی ہو گئی، لوٹھا کی لوٹھی، پوری جوان عورت بن گئی۔ سترھویں میں تو ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کی چھوٹی بہن ہے چنانچہ اب نکی کو دن رات اس کے بیاہ کی فکر ستانے لگی۔''

''نکی نے بڑی دوڑ دھوپ کی۔ کوئی صاف انکار تو نہیں کرتا تھا۔ مگر دل سے حامی بھی نہیں بھرتا تھا۔ اس نے محسوس کیا

کہ ہونہ ہولوگ اس سے ڈرتے ہیں۔اس کی یہ صفت کہ لڑنے کے فن میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی دراصل اس کے آڑے آ رہی تھی۔۔۔۔۔''

وہ مایوسی کی سی کیفیت میں اپنی ہی بیٹی کے طعنے کی زد میں آ گئی۔

''نکی کو ان دو لفظوں سے سخت صدمہ پہنچا۔ بڑے دکھی لہجے میں اس نے بھولی سے سوال کیا'' کیا تو بھی مجھے رذیل سمجھتی ہے؟''

نکی کے لیے یہ تبدیلی بڑی مایوس کن تھی۔حالات کی اس تبدیلی نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔

''تھک ہار کر وہ بعض اوقات کوئی سہارا ٹٹولنے لگتی اور سوچتی۔کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ طلاق نہ لیتی۔آج بیٹی کا بوجھ گام کے کندھوں پر ہوتا۔نکھٹو تھا۔پرلے درجے کا ظالم تھا۔عیبی تھا مگر بیٹی کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کرتا۔یہ اس کے عجز کی انتہا تھی۔

عین مرتے وقت اس کی کیفیت یوں ہوگئی جیسے لڑ رہی ہو۔وہ بڑ بڑاتی رہی۔

''آواز نکی کے حلق میں رکنے لگی۔تھوڑی دیر بعد گھنگرو بجنے لگا۔تشنج سے پیچ و تاب کھا رہی تھی اور ہذیانی کیفیت میں چلا رہی تھی''اوگام۔۔۔۔۔اور خدا مجھے نہ مار۔۔۔۔۔اوخدا۔۔۔۔۔اوگام۔''

نکی یہی بڑبڑاتے ہوئے مرگئی۔



گھاٹن لڑکی

ایک مزدور لڑکی۔۔۔۔۔!جونجانے کون تھی۔تاہم وہ گھاٹن لڑکی تین طرح کے واضح خدوخال کے ساتھ افسانے میں اپنا کردار واضح کرتی ہے۔

مجسم بو،اس کی چھاتی اور اس کے بدن کا خلوص

گھاٹن لڑکی کے سارے جسمانی خدوخال سب دھندلا جاتے ہیں اور واضح ہوتی ہے تو صرف بو۔۔۔۔۔!وہ

گھاٹن لڑکی بوتھی یا بو ہی کو گھاٹن لڑکی کا نام دیا گیا تھا۔

''ساری رات رندھیر کو اس کے جسم سے عجیب وغریب بو آتی رہی تھی۔ اس بو کو جو بیک وقت خوشبو اور بدبو تھی، وہ تمام رات پیتا رہا تھا۔ اس کی بغلوں سے، اس کی چھاتیوں سے، اس کے بالوں سے، اس کے پیٹ سے ہر جگہ سے یہ بو جو بدبو بھی تھی اور خوشبو بھی، رندھیر کے ہر سانس میں موجود ہوتی تھی۔ تمام رات وہ سوچتا رہا تھا کہ یہ گھاٹن لڑکی بالکل قریب ہونے پر بھی ہرگز ہرگز اتنی زیادہ قریب نہ ہوتی، اگر اس کے ننگے بدن سے یہ بو نہ اڑتی یہ بو جو اس کے دل ودماغ کے ہر سلوٹ میں رینگ گئی تھی۔ اس کے تمام پرانے اور نئے خیالوں میں رچ گئی تھی۔

اس بو نے اس لڑکی کو اور رندھیر کو ایک رات کے لیے آپس میں حل کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ عمیق ترین گہرائیوں مین اتر گئے تھے۔ جہاں پہنچ کر وہ ایک خالص انسانی لذت میں تبدیل ہو گئے تھے۔ ایسی لذت جو لمحاتی ہونے کے باوجود دائمی تھی۔ جو مائل پرواز ہونے کے باوجود ساکن اور جامد تھی۔۔۔۔۔ وہ دونوں ایک ایسا پنچھی بن گئے تھے جو آسمان کی نیلاہٹوں میں اڑتا اڑتا غیر متحرک دکھائی دیتا ہے۔

اس بو کو جو اس گھاٹن لڑکی کے ہر مسام سے باہر نکلتی تھی۔ رندھیر اچھی طرح سمجھتا تھا حالانکہ وہ اس کا تجزیہ نہیں کر سکتا تھا۔ جس طرح بعض اوقات مٹی پر پانی چھڑ کنے سے سوندھی سوندھی باس پیدا ہوتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن نہیں وہ بو کچھ اور ہی قسم کی تھی۔ اس میں لونڈر اور عطر کا مصنوعی پن نہیں تھا، وہ بالکل اصلی تھی۔۔۔۔۔ عورت اور مرد کے باہمی تعلقات کی طرح اصلی اور ازلی۔

رندھیر کو پسینے کی بو سے سخت نفرت تھی وہ نہانے کے بعد عام طور پر اپنی بغلوں وغیرہ مُں خوشبودار پوڈر لگاتا تھا یا کوئی ایسی دوا استعمال کرتا تھا جس سے پسینے کی بو دب جائے، لیکن حیرت ہے کہ اس نے کئی بار۔۔۔۔۔ ہاں، کئی بار اس گھاٹن لڑکی کی بالوں بھری بغلوں کو چوما اور اسے بالکل گھن نہ آئی۔ بلکہ عجیب طرح کی لذت محسوس ہوئی۔ اس کی بغلوں کے نرم نرم بال پسینے کے باعث گیلے ہو رہے تھے۔ ان سے بھی وہی بو نکلتی تھی جو غایت درجہ قابل فہم ہونے کے باوجود نا قابل فہم تھی۔ رندھیر کو ایسا لگتا تھا کہ وہ اس بو کو جانتا ہے، پہچانتا ہے، اس کا مطلب بھی سمجھتا ہے۔ لیکن کسی اور کو سمجھا نہیں سکتا۔''

''۔۔۔۔۔ اصل میں رندھیر کے دل ودماغ میں وہ بو بسی ہوئی تھی جو اس گھاٹن لڑکی کے جسم سے بغیر کسی بیرونی کوشش کے باہر نکل رہی تھی۔ وہ بو جو حنا کے عطر سے کہیں زیادہ ہلکی پھلکی اور دوررس تھی جس میں سونگھے جانے کا اضطراب

نہیں تھا، جوخود بخود ناک کے رستے داخل ہوکر اپنی صحیح منزل پر پہنچ گئی تھی۔

رندھیر نے آخری کوشش کرتے ہوئے اس لڑکی کے دودھیالے جسم پر ہاتھ پھیرا، مگر اسے کوئی کپکپاہٹ محسوس نہ ہوئی۔۔۔۔۔اس کی نئی نویلی بیوی جو فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کی لڑکی تھی، جس نے بی اے تک تعلیم پائی تھی اور اپنے کالج میں سینکڑوں لڑکوں کے دل کی دھڑکن تھی رندھیر کی نبض تیز نہ کرسکی۔۔۔۔۔وہ حنا کی مرتی ہوئی خوشبو میں اس بو کی جستجو کرتا رہا جو برسات کے انہی دنوں میں جب کہ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے بارش میں نہارہے تھے، اس گھاٹن لڑکی کے میلے جسم سے آئی تھی۔''

گھاٹن لڑکی اپنے صحت مند سینے کے ساتھ اس افسانے میں عیاں ہوتی ہے۔

''رندھیر نے جب گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اندر بلایا تھا تو اسے ہرگز یقین نہیں تھا کہ وہ اس کو اپنے ساتھ سلائے گا۔لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد جب اس نے اس کے بھیگے ہوئے کپڑے دیکھ کر یہ خیال کیا تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ بیچاری کو نمونیہ ہو جائے تو رندھیر نے اس سے کہا تھا'' یہ کپڑے اتار دو، سردی لگ جائے گی۔''

وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ کیونکہ اس کی آنکھوں میں شرم کے لال ڈورے تیر گئے تھے۔مگر بعد میں جب رندھیر نے اسے اپنی سفید دھوتی نکال کر دی تو اس نے کچھ دیر سوچ کر اپنا کاشٹا کھولا جس کا میل بھیگنے کے باعث ابھر آیا تھا۔۔۔۔کاشٹا کھول کر اس نے ایک طرف رکھ دیا اور جلدی سے سفید دھوتی اپنی رانوں پر ڈال لی۔ پھر اس نے اپنی پھنسی پھنسی چولی اتارنے کی کوشش شروع کی جس کے دونوں کناروں کو ملا کر اس نے ایک گانٹھ دے رکھی تھی۔ یہ گانٹھ اس کے تندرست سینے کے ننھے مگر۔۔۔۔۔میلے گڑھے میں جذب سی ہوگئی تھی۔

دیر تک وہ اپنے گھسے ہوئے ناخنوں کی مدد سے چولی کی گرہ کھولنے کی کوشش کرتی رہی جو بارش کے پانی سے بہت زیادہ مضبوط ہوگئی تھی۔ جب تھک ہار گئی تو اس نے مرہٹی زبان میں رندھیر سے کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا:''میں کیا کروں، نہیں کھلتی!''

رندھیر اس کے پاس بیٹھ گیا اور گرہ کھولنے لگا۔تھک ہار کر اس نے ایک ہاتھ میں چولی ایک سرا پکڑا، دوسرے ہاتھ میں دوسرا اور زور سے کھینچا۔ گرہ ایک دم پھسلی ۔ رندھیر کے ہاتھ زور میں ادھر ادھر ہٹے اور دو دھڑکتی ہوئی چھاتیاں نمودار ہوئیں۔ رندھیر نے ایک لحظے کے لیے خیال کیا کہ اس کے اپنے ہاتھوں نے اس گھاٹن لڑکی کے سینے پر نرم نرم گندھی ہوئی مٹی

کو چابک دست کمہار کی طرح دو پیالوں کی شکل دے دی ہے۔

اس کی صحت مند چھاتیوں میں وہی گدراہٹ، وہی جاذبیت، وہی طراوت، وہی گرم گرم ٹھنڈک تھی جو کمہار کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے تازہ تازہ کچے برتنوں میں ہوتی ہے۔ مٹمیلے رنگ کی ان جوان چھاتیوں میں جو بالکل بے داغ تھیں، ایک عجیب قسم کی چمک حلول تھی۔ سیاہی مائل گندمی رنگ کے نیچے دھندلی روشنی کی ایک تہ سی تھی جس نے یہ عجیب و غریب چمک پیدا کر دی تھی، جو چمک ہونے کے باوجود چمک نہیں تھی۔ اس کے سینے پر چھاتیوں کے یہ ابھار دیئے معلوم ہوتے تھے جو تالاب کے گدلے پانی کے اندر جل رہے ہوں۔''

''رندھیر کے ہاتھ ساری رات اس کی چھاتیوں پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے چھوٹی چھوٹی چوچیاں اور وہ موٹے موٹے مسام جوان کے اردگرد ایک کالے دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے، اس ہوائی لمس سے بھی جاگ اٹھتے اور اس گھاٹن لڑکی کے سارے جسم میں ارتعاش پیدا ہو جاتا کہ رندھیر خود بھی ایک لحظے کے لیے کپکپا اٹھتا۔''

گھاٹن لڑکی کے بدن کا خلوص ہی اسے منفرد بنا گیا۔

''کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے رات کے دودھیالے اندھیرے میں جھمکوں کی طرح تھرتھرا رہے تھے اور نہا رہے تھے، اور وہ گھاٹن لونڈیا رندھیر کے ساتھ کپکپاہٹ بن کر چمٹی تھی۔''

''ساری رات وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی رہی گویا ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے تھے۔ انہوں نے بمشکل ایک دو باتیں کی ہوں گی۔ کیوں کہ جو کچھ انہیں کہنا سننا تھا، سانسوں، ہونٹوں اور ہاتھوں سے طے ہوتا رہا تھا۔'' رندھیر کے ہاتھ ساری رات اس کی چھاتیوں پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے چھوٹی چھوٹی چوچیاں اور وہ موٹے موٹے مسام جوان کے اردگرد ایک کالے دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے، اس ہوائی لمس سے بھی جاگ اٹھتے اور اس گھاٹن لڑکی کے سارے جسم میں ارتعاش پیدا ہو جاتا کہ رندھیر خود بھی ایک لحظے کے لیے کپکپا اٹھتا۔''

ایسی کپکپاہٹوں سے رندھیر کا سینکڑوں مرتبہ تعارف ہو چکا تھا۔ وہ اس کی لذت سے اچھی طرح آشنا تھا۔ کئی لڑکیوں کے نرم اور سخت سینوں کے ساتھ اپنا سینہ ملا کر وہ ایسی راتیں گزار چکا تھا۔ کئی لڑکیوں کے نرم اور سخت سینوں کے ساتھ اپنا سینہ ملا کر وہ ایسی راتیں گزار چکا تھا۔ وہ ایسی لڑکیوں کیساتھ بھی رہ چکا تھا جو بالکل الہڑ تھیں اور اس کے ساتھ لپیٹ کر گھر کی وہ تمام باتیں سنا دیا کرتی تھیں جو کسی غیر کو نہیں سنانا چاہیں۔، وہ ایسی لڑکیوں سے جسمانی رشتہ قائم کر چکا تھا جو ساری مشقت خود کرتی

تھیں اور اسے کوئی تکلیف نہیں دیتی تھیں۔مگر یہ گھاٹن لڑکی جو املی کے درخت کے نیچے بھیگی ہوئی کھڑی تھی اور جس کو اس نے اشارے سے اوپر بلالیا تھا، بہت ہی مختلف تھی۔''

برسات کے یہی دن تھے۔کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے کپکپا رہے تھے۔اس گھاٹن لڑکی کے دونوں کپڑے جو پانی سے شرابور ہو چکے تھے، ایک غلیظ ڈھیر کی شکل میں فرش پر پڑے تھے اور وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔اس کے ننگے اور میلے بدن کی گرمی رندھیر کے جسم میں وہ کیفیت پیدا کررہی تھی جو سخت سردیوں میں نائیوں کے غلیظ، مگر گرم حمام میں نہاتے وقت محسوس ہوا کرتی تھی۔''

رندھیر کے ہاتھ بہت دیر تک اس گوری چٹی لڑکی کے دودھ ایسے سفید سینے پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے۔اس کی انگلیوں نے اس گورے گورے جسم میں کئی ارتعاش دوڑتے ہوئے محسوس کئے تھے۔اس نرم نرم جسم کے کئی گوشوں میں اسے گھٹی ہوئی کپکپاہٹوں کا بھی پتہ چلا تھا جب اس نے اپنا سینہ اس کے سینے کے ساتھ ملایا تو رندھیر کے جسم کے ہر مسام نے اس لڑکی کے چھیڑے ہوئے تاروں کی آواز سنی۔۔۔۔''لیکن وہ پکار جو اس نے گھاٹن لڑکی کے جسم کی بو میں سونگھی تھی ۔۔۔۔وہ پکار جو دودھ کے پیاسے بچے کے رونے سے کہیں زیادہ قابل فہم تھی۔۔۔۔وہ پکار جو صوتی حدود سے نکل کر بے آواز ہو گئی تھی۔

رندھیر سلاخوں والی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔اس کے بہت قریب پیپل کے پتے لرز رہے تھے، مگر وہ ان کی لرزشوں کے اس پار دور۔۔۔۔۔بہت دور دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔جہاں اسے مٹمیلے بادلوں میں ایک عجیب قسم کی دھندلی روشنی گھلی ہوئی دکھائی دیتی تھی جیسی اس گھاٹن لڑکی کے سینے میں اسے نظر آئی تھی۔ایسی روشنی جو راز کی بات کی طرح چھپی ہوئی مگر ظاہر تھی۔''

''رندھیر نے آخری کوشش کرتے ہوئے اس لڑکی کے دودھیالے جسم پر ہاتھ پھیرا، مگر اسے کوئی کپکپاہٹ محسوس نہ ہوئی۔۔۔۔۔اس کی نئی نویلی بیوی جو فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کی لڑکی تھی، جس نے بی اے تک تعلیم پائی تھی اور اپنے کالج میں سینکڑوں لڑکوں کے دل کی دھڑکن تھی رندھیر کی نبض تیز نہ کرسکی۔''

یوں ایک گھاٹن لڑکی، اپنی بو کے باعث منٹو کے نسوانی کردار کے طور پر مجسم ہو گئی۔



پیرن

''ایک معمولی شکل وصورت کی پارسی لڑکی تھی جس سے برج موہن کا معاشقہ قریباً تین برس سے چل رہا تھا۔''

سعادت اور برج موہن کے درمیان پہلے پہل پیرن کے معاملے میں کبھی بات نہیں ہوئی تھی۔

''ہر اتوار کو برج موہن مجھ سے آٹھ آنے ٹرین کے کرائے کے لیے لیتا۔ پیرن کے گھر پہنچتا۔ دونوں آدھ گھنٹے تک آپس میں باتیں کرتے۔ برج موہن السٹرٹیڈ ویکلی کے کراس ورڈ پزل کے حل اس کو دیتا اور چلا آتا۔ وہ بیکار تھا۔ سارا دن سر نیوڑھائے یہ پزل اپنی دوست پیرن کے لیے حل کرتا رہتا تھا۔ اس کو چھوٹے چھوٹے کئی انعام مل چکے تھے، مگر وہ سب پیرن نے وصول کئے تھے۔ برج موہن نے ان میں سے ایک دمڑی بھی اس سے نہ مانگی تھی۔

برج موہن کے پاس پیرن کی بے شمار تصویریں تھیں۔ شلوار قمیض میں چست پاجامے میں ساڑھی میں، فراک میں، بیدنگ کا سیٹیوم میں، فینسی ڈریس میں ــــــ غالباً سو سے اوپر ہونگی۔ پیرن قطعاً خوبصورت نہیں تھی، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ بہت سی ادنیٰ شکل وصورت کی تھی۔ لیکن میں نے اپنی اس رائے کا اظہار برج موہن سے کبھی نہیں کیا تھا۔ میں نے پیرن کے متعلق کبھی کچھ پوچھا ہی نہیں تھا کہ وہ کون ہے، کیا کرتی ہے، برج موہن سے اس کی ملاقات کیسے ہوئی، عشق کی ابتداء کیون کر ہوئی، کیا وہ اسے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے ــــــ برج موہن نے بھی اس کے بارے میں مجھ سے کبھی بات چیت نہ کی تھی۔ بس ہر اتوار کو وہ ناشتے کے بعد مجھ سے آٹھ آنے کرائے کے لیتا اور اس سے ملنے کے لیے باندرہ روانہ ہو جاتا اور دوپہر تک لوٹ آتا۔''

پھر ایک دن سعادت پر پیرن کی شخصیت کا انکشاف ہوا۔

''دوپہر کو لوٹا تو اس نے خلاف معمول مجھ سے کہا: ''آج معاملہ ختم ہو گیا؟''

میں نے اس سے پوچھا: ''کونسا معاملہ؟'' مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کس معاملے کی بات کر رہا ہے۔

برج موہن نے، جیسے اس کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو، مجھ سے کہا: ''پیرن سے آج دوٹوک فیصلہ ہو گیا ہے ــــــ میں نے اس سے کہا۔ جب بھی تم سے ملنا شروع کرتا ہوں، مجھے کوئی کام نہیں ملتا۔ تم بہت منحوس ہو۔ اس نے کہا

بہتر ہے، ملنا چھوڑ دو۔ دیکھوں گی تجھے کیسے کام ملتا ہے۔ میں منحوس ہوں، مگر تم اول درجے کے نکھٹو اور کام چور ہو۔۔۔۔۔ سو اب یہ قصہ ختم ہو گیا ہے اور میرا خیال ہے انشاءاللہ کل ہی مجھے کام مل جائے گا صبح تم مجھے چار آنے دینا۔ میں سیٹھ نانو بھائی سے ملوں گا، وہ مجھے ضرور اپنا اسسٹنٹ رکھ لے گا۔''

یہ سیٹھ نانو بھائی جو فلم ڈائریکٹر تھا، متعدد مرتبہ برج موہن کو ملازمت دینے سے انکار کر چکا تھا، کیونکہ اس کا بھی پیرن کی طرح یہی خیال تھا کہ وہ کام چور اور نکما ہے۔ لیکن دوسرے روز جب برج موہن مجھ سے چار آنے لے کر گیا تو دوپہر کو اس نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ سیٹھ نانو بھائی نے بہت خوش ہو کر اسے ڈھائی سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا ہے۔ کنٹریکٹ ایک برس کا ہے۔ جس پر دستخط ہو چکے ہیں۔ پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو روپے نکالے اور مجھے دکھائے: ''یہ ایڈوانس ہے ۔۔۔۔۔ جی تو چاہتا ہے کہ کنٹریکٹ اور سو روپے لے کر باندرہ جاؤں اور پیرن سے کہوں کہ لو دیکھو، مجھے کام مل گیا ہے۔ لیکن ڈر ہے کہ نانو بھائی مجھے فوراً جواب دے دے گا۔۔۔۔۔ میرے ساتھ ایک نہیں کئی مرتبہ ایسا ہو چکا ہے۔ ادھر ملازمت ملی، ادھر پیرن سے ملاقات ہوئی ۔۔۔۔۔ معاملہ صاف۔ کسی نہ کسی بہانے مجھے نکال باہر کیا گیا۔ خدا معلوم اس لڑکی میں یہ نحوست کہاں سے آ گئی۔ اب میں کم از کم ایک برس تک اس کا منہ نہیں دیکھوں گا۔ میرے پاس کپڑے بہت کم رہ گئے ہیں۔ ایک برس لگا کر کچھ بنوالوں تو پھر دیکھا جائے گا۔''

سعادت نے اسے وہم خیال کیا لیکن پھر ایک دن اسے بھی یقین آ گیا۔

''ایک روز وہ اسٹوڈیو گیا ہوا تھا کہ اس کے نام ایک خط آیا۔ شام کو جب وہ لوٹا تو میں اسے یہ خط دینا بھول گیا۔ صبح ناشتے پر مجھے یاد آیا تو میں نے یہ خط اس کے حوالے کر دیا لفافہ پکڑتے ہی وہ زور سے چیخا: ''لعنت!'' میں نے پوچھا: ''کیا ہوا ''؟

''وہی پیرن ۔۔۔۔۔ اچھی بھلی زندگی گزر رہی تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے چمچ سے لفافہ کھولا خط کا کاغذ نکالا اور مجھ سے کہا: ''وہی کم بخت ہے ۔۔۔۔۔ میں کبھی اس کی ہینڈ رائٹنگ بھول سکتا ہوں!''

میں نے پوچھا: ''کیا لکھتی ہے؟''

''میرا سر ۔۔۔۔۔ کہتی ہے مجھ سے اس اتوار کو ضرور ملو، تم سے کچھ کہنا ہے۔'' یہ کہہ کر برج موہن نے خط لفافے میں ڈالا اور جیب میں رکھ لیا۔ ''لو بھئی منٹو، نوکری سے انشاءاللہ کل ہی جواب مل جائے گا۔''

''کیا بکواس کرتے ہو؟''

موہن نے بڑے وثوق سے کہا: ''نہیں منٹو، تم دیکھ لینا۔ کل اتوار ہے۔ سیٹھ نانو بھائی کو ضرور مجھ سے کوئی نہ کوئی شکایت پیدا ہوگی۔ اور وہ مجھے فوراً نکال باہر کرے گا۔''

میں نے اس سے کہا: ''اگر تمہیں اتنا وثوق ہے تو مت جاؤ اس سے ملنے۔''

''یہ نہیں ہوسکتا۔۔۔۔۔ وہ بلائے تو مجھے جانا ہی پڑتا ہے۔''

''کیوں؟''

''ملازمت کرتے کرتے کچھ میں بھی اکتا چکا ہوں۔۔۔۔۔ چھ مہینے سے اوپر ہوگئے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور چلا گیا۔

دوسرے روز ناشتہ کر کے وہ باندرہ چلا گیا۔ پیرن سے ملاقات کر کے لوٹا تو اس نے اس ملاقات کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ میں نے اس سے پوچھا: ''مل آئے اپنے منحوس ستارے سے؟''

''ہاں بھئی۔۔۔۔۔ اس سے کہہ دیا کہ ملازمت سے بہت جلد جواب مل جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ کھاٹ پر سے اٹھا: ''چلو آؤ کھانا کھا آئیں۔''

ہم دونوں نے حاجی کے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اس دوران میں پیرن کی کوئی بات نہ ہوئی۔ رات کو سونے سے پہلے اس نے صرف اتنا کہا: ''اب دیکھئے کل کیا گل کھلتا ہے!''

میرا خیال تھا کہ کچھ بھی نہیں ہوگا مگر دوسرے روز برج موہن خلافِ معمول اسٹوڈیو سے جلدی لوٹ آیا۔ مجھ سے ملا تو خوب زور سے ہنسا: ''چھٹی منٹو بھائی۔''

میں سمجھا مذاق کر رہا ہے: ''ہٹاؤ جی۔''

''جو ہٹنا تھا وہ تو ہٹ گیا۔۔۔۔۔ اب میں کیسے ہٹاؤں۔۔۔۔۔ سیٹھ نانو بھائی پر ٹانچ آگئی ہے۔۔۔۔۔ اسٹوڈیو سیل ہوگیا ہے۔ میری وجہ سے خواہ مخواہ بیچارے نانو بھائی پر بھی آفت آئی۔'' یہ کہہ کر برج موہن پھر ہنسنے لگا۔

میں نے صرف اتنا کہا: ''یہ عجیب سلسلہ ہے!''

''دیکھ لو۔۔۔۔۔ اسے کہتے ہیں ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔'' برج موہن نے سگریٹ سلگایا اور کیمرہ اٹھا کر باہر گھومنے

چلا گیا۔"

پیرن کی نحوست بارے یقین ہونے کے باوجود برج موہن اس سے ملتا رہا، اس لیے کہ

"میں نے ایک روز اس سے پوچھا: "برج، کیا پیرن کو بھی تم سے محبت ہے؟"

"نہیں، وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔"

"تم سے کیوں ملتی ہے؟"

اس لیے کہ میں ذہین ہوں، اس کے بھدے چہرے کو خوبصورت بنا کر پیش کر سکتا ہوں۔ اس کے لیے کراس ورڈ پزل حل کرتا ہوں۔ کبھی کبھی اس کو انعام بھی دلوا دیتا ہوں۔۔۔۔۔ منٹو، تم نہیں جانتے ان لڑکیوں کو۔ میں خوب پہچانتا ہوں انہیں۔۔۔۔۔ جس سے وہ محبت کرتی ہے، اس میں جو کمی ہے، مجھ سے مل کر پوری کر لیتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ مسکرایا: "بڑی چار سو بیس ہے!"

میں نے قدرے حیرت سے پوچھا: "مگر تم کیوں اس سے ملتے ہو؟"

برج موہن ہنسا، چشمے کے پیچھے اپنی آنکھیں سکوڑ کر اس نے کہا: "مجھے مزا آتا ہے۔"

"کس بات کا؟"

"اس کی نحوست کا۔۔۔۔۔ میں اس کا امتحان لے رہا ہوں۔ اس کی نحوست کا امتحان۔۔۔۔۔ یہ نحوست اپنے امتحان میں پوری اتری ہے۔ میں نے جب بھی اس سے ملنا شروع کیا۔ مجھے اپنے کام سے جواب ملا۔۔۔۔۔ اب میری ایک خواہش ہے کہ اس کے منحوس اثر کو چکمہ دے جاؤں۔"

میں نے اس سے پوچھا: "کیا مطلب؟"

برج موہن نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "میرا جی چاہتا ہے کہ ملازمت سے جواب ملنے سے پہلے ملازمت سے علیحدہ ہو جاؤں، یعنی خود اپنے آقا کو جواب دے دوں۔ اس سے بعد میں کہوں، جناب مجھے معلوم تھا کہ آپ مجھے برطرف کرنے والے ہیں، اس لیے میں نے آپ کو زحمت نہ دی اور خود علیحدہ ہو گیا اور آپ مجھے برطرف نہیں کر رہے تھے، یہ میری دوست پیرن تھی جس کی ناک کیمرے میں اس طرح گھستی ہے جیسے تیر!"

برج موہن مسکرایا: "یہ میری ایک چھوٹی سی خواہش ہے، دیکھو پوری ہوتی ہے یا نہیں۔"

میں نے کہا: ''عجیب وغریب خواہش ہے۔''

''ایک اتوار برج باندرہ سے واپس آیا تو اس نے مجھ سے کہا: ''لو بھئی منٹو، آج معاملہ ختم ہو گیا۔''

میں نے اس سے پوچھا: ''پیرن والا؟''

''ہاں بھئی۔۔۔۔۔ کپڑے ختم ہو رہے تھے، میں نے سوچا کہ یہ سلسلہ ختم کرو۔ اب انشاءاللہ دنوں ہی میں کوئی نہ کوئی ملازمت مل جائے گی۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے سیٹھ نیاز علی سے ملوں۔۔۔۔۔ اس نے ایک فلم بنانے کا اعلان کیا ہے۔۔۔۔۔ کل ہی جاؤں گا۔ تم یار ذرا اس کے دفتر کا پتہ لگا لینا۔''

میں نے اس کے دفتر کا نیا فون ایک دوست سے پوچھ کر برج موہن کو بتا دیا۔ وہ دوسرے روز وہاں گیا۔ شام کو لوٹا۔ اس کے مطمئن چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ''لو بھئی منٹو' یہ کہہ کر اس نے جیب سے ٹائپ شدہ کاغذ نکالا اور میری طرف پھینک دیا: ''ایک پکچر کا کنٹریکٹ۔ تنخواہ دو سو روپے ماہوار۔ کم ہے، لیکن سیٹھ نیاز علی نے کہا ہے بڑھا دوں گا۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے!''

میں ہنسا: ''اب پیرن سے کب ملو گے؟''

سعادت کو بھی پیرن کو نحوست کا یقین ہوتا چلا گیا۔

''پانچ مہینے گزر گئے کہ اچانک ایک روز پیرن کا خط برج موہن کو موصول ہوا: ''لو بھئی منٹو، عزرائیل صاحب تشریف لے آئے۔''

صحیح بات ہے کہ میں نے اس وقت خط دیکھ کر خوف سا محسوس کیا، مگر برج موہن نے مسکراتے ہوئے لفافہ چاک کیا۔ خط کا کاغذ نکال کر پڑھا۔ بالکل مختصر تحریر تھی۔ میں نے برج سے پوچھا: ''کیا فرماتی ہیں؟''

''فرماتی ہیں، اتوار کو مجھ سے ضرور ملو ایک اشد ضروری کام ہے'' برج موہن نے خط لفافے میں واپس ڈال کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

میں نے اس سے پوچھا: ''جاؤ گے؟''

''جانا ہی پڑے گا۔۔۔۔۔'' پھر اس نے یہ فلمی گیت گانا شروع کر دیا۔

''مت بھول مسافر تجھے جانا ہی پڑے گا۔''

میں نے اس سے کہا: ''برج، مت جاؤ اس سے ملنے۔۔۔۔۔ بڑے اچھے دن گزر رہے ہیں ہمارے۔۔۔۔۔ تم

نہیں جانتے، میں خدا معلوم کس طرح تمہیں آٹھ آنے دیا کرتا تھا۔"

برج موہن مسکرایا: "مجھے سب معلوم ہے، لیکن افسوس ہے کہ اب وہ دن پھر آنے والے ہیں۔ جب تم خدا معلوم کس طرح مجھے ہر اتوار آٹھ آنے دیا کروگے۔"

لیکن۔۔۔۔۔!

"برج موہن نے مجھے استعفیٰ کا کاغذ دکھایا۔ دوسرے روز خلاف معمول اس نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور دفتر روانہ ہوگیا۔ شام کو لوٹا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ مجھے یہ بالآخر اس سے پوچھنا پڑا: "کیوں برج، کیا ہوا؟"

اس نے بڑی ناامیدی سے سر ہلایا "کچھ نہیں یار۔۔۔۔۔ سارا قصہ ہی ختم ہوگیا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے سیٹھ نیاز علی کو استعفیٰ پیش کیا تو اس نے مسکرا کر مجھے ایک آفیشل خط دیا۔ اس میں لکھا تھا۔ کہ میری تنخواہ پچھلے مہینے سے دوسو کے بجائے تین سو روپے ماہوار کردی گئی ہے!"

پیرن سے برج موہن کی دلچسپی ختم ہوگئی۔ اس نے مجھ سے ایک روز کہا: "پیرن کی نحوست ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ بھی ختم ہوگئی۔۔۔۔۔ اور میرا ایک نہایت دلچسپ مشغلہ بھی ختم ہوگیا۔ اب کون مجھے بیکار رکھنے کا موجب ہوگا!"

برج موہن کو پیرن کی ذات سے نہیں بلکہ اس کی شخصیت کے ساتھ بند ہے اس وہم سے مقصد تھا۔ اور وہم بھی ایسا کہ جسے خود برج موہن چکمہ دینا چاہتا تھا۔ وہ شروع سے ہی اس وہم کا شکار تھا اور وہ وہم تھا۔۔۔۔۔؟

"اس کی نحوست کا۔۔۔۔۔ میں اس کا امتحان لے رہا ہوں۔ اس کی نحوست کا امتحان۔۔۔۔۔ یہ نحوست اپنے امتحان میں پوری اتری ہے۔ میں نے جب بھی اس سے ملنا شروع کیا۔ مجھے اپنے کام سے جواب ملا۔۔۔۔۔ اب میری ایک خواہش ہے کہ اس کے منحوس اثر کو چکمہ دے جاؤں۔"

(پیرن از ٹھنڈا گوشت)



رکما بائی

ایک سادیت پسند ہندو عورت۔۔۔۔۔! وہ بمبئی میں موجود ایک بلڈنگ کی کھولی میں رہتی تھی۔ اور پہلی بار جب وہ سامنے آتی تو۔۔۔۔۔،

''یوں تو میں رکما بائی کو کئی دفعہ دیکھ چکا تھا لیکن اس دن کم بخت نے بدن پر تیل ملا ہوا تھا اور ایک پتلی دھوتی لپیٹ رکھی تھی۔ جانے کیا ہوا مجھے، جی چاہا اس کی دھوتی اتار کر زور زور سے مالش شروع کر دوں۔ بس صاحب اسی روز سے اس بندہ نابکار نے اپنا دل، دماغ سب کچھ اس کے حوالے کر دیا۔''

کیا عورت تھی۔۔۔۔۔ بدن تھا پتھر کی طرح سخت، مالش کرتے کرتے ہانپنے لگ گیا تھا مگر وہ اپنے باپ کی بیٹی یہی کہتی رہی ''تھوڑی دیر اور۔''

''شادی شدہ۔۔۔۔۔ جی ہاں شادی شدہ تھی اور خان چوکیدار نے کہا تھا کہ اس کا ایک یار بھی ہے۔''

''رکما بائی نے میری طرف گھور کے دیکھا۔ خدا کی قسم میری روح لرز گئی۔ بھاگ گیا ہوتا وہاں سے، لیکن اس نے مسکراتے ہوئے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

جب اندر گیا تو اس نے کھولی کا دروازہ بند کر کے مجھ سے کہا: ''بیٹھ جاؤ!'' میں بیٹھ گیا تو اس نے میرے پاس آ کر کہا: ''دیکھو میں جانتی ہوں تم کیا چاہتے ہو۔ لیکن جب تک گردھاری زندہ ہے، تمہاری مراد پوری نہیں ہو سکتی۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے پاس دیکھ کر میرا خون گرم ہو گیا تھا۔ کنپٹیاں ٹھک ٹھک کر رہی تھیں۔ کم بخت نے آج بھی بدن پر تیل ملا ہوا تھا اور وہی پتلی دھوتی لپیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا اور دبا کر کہا: ''مجھے کچھ معلوم نہیں تم کیا کہہ رہی ہو۔'' اف! اس کے بازوؤں کے پٹھے کس قدر سخت تھے۔۔۔۔۔ عرض کرتا ہوں۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ وہ کس قسم کی عورت تھی۔''

رکما بائی نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا اور۔۔۔۔۔

''دس دن گزر گئے۔ ٹھیک گیارہویں دن، رات کے دو بجے ہاں دو ہی کا عمل تھا۔۔۔۔۔ کسی نے مجھے آہستہ سے

جگایا۔ میں نیچے سیڑھیوں کے پاس جو جگہ ہے نا، وہاں سوتا ہوں۔

آنکھیں کھول کر میں نے دیکھا۔ ارے رکما بائی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا: ''کیا ہے؟'' اس نے ہولے سے کہا: ''آؤ میرے ساتھ۔۔۔۔۔'' میں ننگے پاؤں اس کے ساتھ ہولیا۔ میں نے اور کچھ نہ سوچا اور وہیں کھڑے کھڑے اس کو سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ اس نے میرے کان میں کہا: ''ابھی ٹھہرو!'' پھر بتی روشن کی۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ سامنے چٹائی پر کوئی سو رہا ہے۔ منہ پر کپڑا ہے۔ میں نے اشارے سے پوچھا۔ ''یہ کیا؟'' رکما نے کہا: ''بیٹھ جاؤ۔'' میں الو کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ میرے پاس آئی اور بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر اس نے ایسی بات کہی؟ جس کو سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔۔۔۔۔ بالکل برف ہو گیا۔ صاحب۔۔۔۔۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔۔۔۔۔ جانتے ہیں رکما نے مجھ سے کیا کہا۔۔۔۔۔'

پڑھیے کلمہ!۔۔۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی عورت نہیں دیکھی۔۔۔۔۔ کم بخت نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔۔۔۔۔ ''میں نے گردھاری کو مار ڈالا ہے؟''۔۔۔۔۔ آپ یقین کیجیے اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک ہٹے کٹے آدمی کو قتل کیا تھا۔۔۔۔۔ کیا عورت تھی صاحب۔۔۔۔۔ مجھے جب بھی وہ رات یاد آتی ہے، قسم خداوند پاک کی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس نے مجھے وہ چیز دکھائی جس سے اس ظالم نے گردھاری کا گلا گھونٹا تھا۔ بجلی کے تاروں کی گندھی ہوئی ایک مضبوط رسی سی تھی۔ لکڑی پھنسا کر اس نے زور سے کچھ ایسے پیچ دیئے تھے کہ بے چارے کی زبان اور آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔۔۔۔۔ کہتی تھی بس یوں چٹکیوں میں کام تمام ہو گیا تھا۔

کپڑا اٹھا کر جب اس نے گردھاری کی شکل دکھائی تو میری ہڈیاں تک برف ہو گئیں۔ لیکن وہ عورت جانے کیا تھی۔ وہیں لاش کے سامنے اس نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ قرآن کی قسم! میرا خیال تھا کہ ساری عمر کے لیے نامرد ہو گیا ہوں۔ مگر صاحب جب اس کا گرم گرم پنڈا میرے بدن کے ساتھ لگا اور اس نے ایک عجیب و غریب قسم کا پیار کیا تو اللہ جانتا ہے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ زندگی بھر وہ رات مجھے یاد رہے گی۔۔۔۔۔ سامنے لاش پڑی تھی لیکن رکما اور میں، دونوں اس سے غافل ایک دوسرے کے اندر دھنسے ہوئے تھے۔

صبح ہوئی تو ہم دونون نے مل کر گردھاری کی لاش کے تین ٹکڑے کئے اوزار اس کے پاس موجود تھے، اس لیے زیادہ

تکلیف نہ ہوئی۔''

پھر ایک رات۔۔۔۔۔،

''اٹھارہویں روز صاحب میں اسی طرح سیڑھیوں کے پاس چارپائی پر سو رہا تھا کہ رکما رات کے بارہ۔۔۔۔۔بارہ نہیں تو ایک ہوگا۔آئی اور مجھے اوپر لے گئی۔

چٹائی پر ننگی لیٹ کر اس نے مجھ سے کہا:''عبدل میرا بدن دکھ رہا ہے، ذرا چمپی کردو۔میں نے فوراً تیل لیا اور مالش کرنے لگا لیکن آدھے گھنٹے میں ہی ہانپنے لگا۔میرے پسینے کی کئی بوندیں اس کے چکنے بدن پر گریں۔لیکن اس نے یہ نہ کہا، بس کر عبدل۔تم تھک گئے ہو۔آخر مجھے ہی کہنا پڑا:''رکما بھئی، اب خلاص۔۔۔۔۔''وہ مسکرائی۔۔۔۔۔میرے خدا کیا مسکراہٹ تھی۔تھوڑی دیر دم لینے کے بعد میں چٹائی پر بیٹھ گیا۔اس نے اٹھ کر بتی بجھائی اور میرے ساتھ لیٹ گئی۔چمپی کر کر کے میں اس قدر تھک چکا تھا کہ کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔رکما کے سینے پر ہاتھ رکھا اور سو گیا۔

جانے کیا بجا تھا۔میں ایک ہڑبڑا کے اٹھا۔گردن میں کوئی سخت سخت سی چیز دھنس رہی تھی۔فوراً مجھے اس تاروالی رسی کا خیال آیا لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرسکوں، رکما میری چھاتی پر چڑھ بیٹھی۔ایک دو ایسے مروڑے دیئے کہ میری گردن گڑگڑ بول اٹھی۔میں نے شور مچانا چاہا۔لیکن ااواز میرے پیٹ میں رہی۔اس کے بعد میں بے ہوش ہوگیا۔

میرا خیال ہے چار بجے ہوں گے۔آہستہ آہستہ مجھے ہوش آنا شروع ہوا۔گردن میں بہت زور کا درد تھا۔میں ویسے ہی دم سادھے پڑا رہا اور ہولے ہولے ہاتھ سے رسی کے مروڑے کھولنے شروع کئے۔۔۔۔۔ایک دم آوازیں آنے لگیں۔میں نے سانس روک لیا۔کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی پر کچھ نظر نہ آیا۔جو آوازیں آ رہی تھیں۔ان سے معلوم ہوتا تھا دو آدمی کشتی لڑ رہے ہیں۔رکما ہانپ رہی تھی۔۔۔۔۔ہانپتے ہانپتے اس نے کہا:''تکا رام !بتی جلا دو''۔۔۔۔۔تکا رام نے ڈرتے ہوئے لہجے میں کہا،''نہیں نہیں، رکما نہیں۔۔۔۔۔''رکما بولی۔۔۔۔۔''بڑے ڈرپوک ہو۔۔۔۔۔صبح اسکے تین ٹکڑے کر کے لے جاؤ گے کیسے!''۔۔۔۔۔میرا بدن بالکل ٹھنڈا ہوگیا۔تکا رام نے کیا جواب دیا، رکما نے پھر کیا کہا، اس کا مجھے کچھ ہوش نہیں۔پتہ نہیں کب ایک دم روشنی ہوئی اور میں آنکھیں جھپکتا اٹھ بیٹھا۔تکا رام کے منہ سے زور کی چیخ نکلی اور وہ دروازہ کھول کر بھاگ گیا۔رکما نے جلدی سے کواڑ بند کردیئے اور کنڈی چڑھا دی۔''

رکمانے جب یہ دیکھا کہ وہ بچ گیا ہے تو۔۔۔۔۔،

''رکما میری طرف گھور گھور کے دیکھ رہی تھی جیسے اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں۔ وہ مجھے مار چکی تھی، لیکن میں اس کے سامنے زندہ بیٹھا تھا۔ وہ مجھ پر جھپٹنے کو تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور بہت سے آدمیوں کی آوازیں آئیں۔ رکمانے جھٹ سے میرا بازو پکڑا اور گھسیٹ کر مجھے غسل خانے کے اندر ڈال دیا۔ اس کے بعد اس نے دروازہ کھولا، پڑوس کے آدمی تھے۔ انہوں نے رکما سے پوچھا ''خیریت ہے۔ ابھی ابھی ہم نے چیخ کی آواز سنی تھی۔'' رکمانے جواب دیا: ''خیریت ہے۔ مجھے سوتے میں چلنے کی عادت ہے۔۔۔۔۔ دروازہ کھول کر باہر نکلی تو دیوار کے ساتھ ٹکرا گئی اور ڈر کر منہ سے چیخ نکل گئی۔'' پڑوس کے آدمی یہ سن کر چلے گئے۔ رکمانے کواڑ بند کئے اور کنڈی چڑھا دی۔ اب مجھے اپنی جان کی فکر ہوئی۔۔۔۔۔ آپ یقین مانئے یہ سوچ کر کہ وہ ظالم مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی، ایک دم میرے اندر مقابلے کی بے پناہ طاقت آ گئی، بلکہ میں نے ارادہ کر لیا کہ رکما کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ غسل خانے سے باہر نکلا تو دیکھا کہ وہ بڑی کھڑکی کے پٹ کھولے باہر جھانک رہی ہے۔ میں ایک دم لپکا۔ چوتڑوں پر سے اوپر اٹھایا اور باہر دھکیل دیا۔ یہ سب یوں چٹکیوں میں ہوا۔ دھپ سی آواز آئی اور میں دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔''

(پڑھئے کلمہ از چغد)



کلونت کور

ایسی سکھ عورت جو جتنی شدت سے محبت کرتی ہے۔ اتنی شدت سے نفرت کرنا بھی جانتی ہے۔ وہ اپنے جذبات اور ان جذبوں کے اظہار میں بھی شدت پسند ہے۔ فطری انداز میں اپنے ماحول کے ساتھ رچی بسی بھرپور عورت۔

''کلونت کور بھرے بھرے ہاتھ پیروں والی عورت تھی۔ چوڑے چکلے کولہے، تھل تھل کرنے والے گوشت سے بھرپور کچھ زیادہ ہی اوپر کو اٹھا ہوا سینہ، تیز آنکھیں، بالائی ہونٹ پر بالوں کا سرمئی غبار، ٹھوڑی کی ساخت سے پتہ چلتا تھا کہ

بڑے دھڑلے کی عورت ہے۔''

ایشر سنگھ کی محبوبہ کلونت کور۔۔۔۔۔! جتنی بھرپور عورت تھی۔ایشر سنگھ اتنا ہی بھرپور مرد۔

''اس کے قد و قامت اور خدوخال سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کلونت کور جیسی عورت کے لیے موزوں ترین مرد ہے۔''

ایشر سنگھ،کلونت کور کے بھرپور ہونے کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔

''ایشر سنگھ نے کلونت کور کو گھور کے دیکھا اور دفعتاً دونوں ہاتھوں سے اس کے ابھرے ہوئے سینے کو مسلنے لگا: ''قسم واہگورو کی! بڑی جاندار عورت ہو۔''

''کلونت کور کا بالائی ہونٹ کپکپانے لگا۔ایشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے کلونت کور کی قمیض کا گھیرا پکڑا اور جس طرح بکرے کی کھال اتارتے ہیں۔اسی طرح اس کو اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔پھر اس نے گھور کے اس کے ننگے بدن کو دیکھا اور زور سے بازو پر چٹکی لیتے ہوئے کہا: ''کلونت! قسم واہگورو کی،بڑی کراری عورت ہے تو۔''

کلونت کور کی محبت ایشر سنگھ سے ایسی تھی کہ وہ دونوں بدن کی آگ ایک دوسرے سے بجھا لیتے تھے۔اپنی شدت پسندی اور عورت کے اس فطری پن کے کہ اس کا محبوب فقط اسی کا رہے،وہ ایشر سنگھ کو ٹوٹ کر چاہتی تھی۔

''چند اور لمحات جب اسی طرح خاموشی میں گزر گئے تو کلونت کور چھلک پڑی۔لیکن تیز تیز آنکھوں کو نچا کر وہ صرف اس قدر کہہ سکی ''ایشر سیاں!''

ایشر سنگھ نے گردن اٹھا کر کلونت کور کی طرف دیکھا،مگر اس کی نگاہوں کی گولیوں کی تاب نہ لا کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

کلونت کور چلائی: ''ایشر سیاں!'' ''لیکن فوراً ہی آواز بھینچ لی اور پلنگ پر سے اٹھ کر اس کی جانب جاتے ہوئے بولی: ''کہاں رہے تم اتنے دن؟''

ایشر سنگھ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری: ''مجھے معلوم نہیں؟''

کلونت کور بھنا گئی: ''یہ بھی کوئی ماں یا جواب ہے!''

ایشر سنگھ نے کرپان ایک طرف پھینک دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی دنوں کا بیمار ہے۔کلونت کور نے پلنگ کی طرف دیکھا جو اب ایشر سنگھ سے لبالب بھرا تھا۔اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔چنانچہ اس کے

ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے بڑے پیار سے پوچھا: ''جانی کیا ہوا ہے تمہیں؟''

ایشر سنگھ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس سے نگاہیں ہٹا کر اس نے کلونت کور کے مانوس چہرے کو ٹٹولنا شروع کیا: ''کلونت!''

آواز میں درد تھا۔ کلونت کور ساری کی ساری سمٹ کر اپنے بالائی ہونٹ میں آئی۔ ''ہاں' جانی!'' کہہ کر وہ اس کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔''

کلونت کور کو یہ شک ہو جاتا ہے کہ اس کے اور ایشر سنگھ کے درمیان کوئی عورت آن موجود ہوئی ہے۔ جس کے باعث ایشر سنگھ پہلے جیسا نہیں رہا۔ وہ بڑے صاف انداز میں اپنے شک کا اظہار کرتی ہے۔

''کلونت کور نے ایک ادا کے ساتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ ایک طرف جھٹک دیئے اور پوچھا: ''تمہیں میری قسم! بتاؤ کہاں رہے۔۔۔۔۔۔شہر گئے تھے؟''

ایشر سنگھ نے ایک ہی لپیٹ میں اپنے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے جواب دیا: ''نہیں۔''

کلونت کور چڑ گئی۔ ''نہیں تم ضرور شہر گئے تھے۔۔۔۔۔اور تم نے بہت سارا روپیہ لوٹا ہے جو مجھ سے چھپا رہے ہو۔''

''وہ اپنے باپ کا تخم نہ ہو جو تم سے جھوٹ بولے۔''

کلونت کور تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی، لیکن فوراً ہی بھڑک اٹھی ''لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا، اس رات تمہیں ہوا کیا۔۔۔۔۔اچھے بھلے میرے ساتھ لیٹے تھے، مجھے تم نے وہ تمام گہنے پہنا رکھے تھے جو تم شہر سے لوٹ کر لائے تھے، میری بھپیاں لے رہے تھے، پر جانے ایک دم تمہیں کیا ہوا، اٹھے کپڑے پہن کر باہر نکل گئے۔''

ایشر سنگھ کا رنگ زرد ہو گیا۔ کلونت کور نے یہ تبدیلی دیکھتے ہی کہا: ''دیکھا کیسے رنگ نیلا پڑ گیا۔۔۔۔۔ایشر سیاں، قسم واہگورو کی، ضرور کچھ دال میں کالا ہے!''

''تیری جان کی قسم، کچھ بھی نہیں۔''

ایشر سنگھ کی آواز بے جان تھی۔ کلونت کور کا شبہ اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ بالائی ہونٹ بھینچ کر اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا: ''ایشر سیاں! کیا بات ہے' تم وہ نہیں ہو جو آج سے آٹھ روز پہلے تھے؟''

ایشر سنگھ ایک دم اٹھ بیٹھا جیسے کسی نے اس پر حملہ کیا تھا۔ کلونت کور کو اپنے تنومند بازوؤں میں سمیٹ کر اس نے پوری

قوت کے ساتھ بھنبھوڑنا شروع کر دیا: ''جانی میں وہی ہوں۔۔۔۔۔گھٹ گھٹ پا چھیاں، تیری نکلے ہڈاں دی گرمی ۔۔۔۔۔''

کلونت کور نے کوئی مزاحمت نہ کی، لیکن وہ شکایت کرتی رہی: ''تمہیں اس رات ہو کیا گیا تھا؟''

''برے کی ماں کا وہ ہو گیا تھا۔''

''بتاؤ گے نہیں؟''

''کوئی بات ہو تو بتاؤں۔''

''مجھے اپنے ہاتھوں سے جلاؤ اگر جھوٹ بولو۔''

ایشر سنگھ نے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دیئے اور ہونٹ اس کے ہونٹوں میں گاڑ دیئے۔ موچھوں کے بال کلونت کور کے نتھنوں میں گھسے تو اسے چھینک آ گئی۔ دونوں ہنسنے لگے۔''

کلونت کور نے تنہائی کے ان لمحوں کو غنیمت جانتے ہوئے، اپنے شک کو سمیٹ لیا اور ایشر سنگھ کی بے باکیوں کو سہارا دینے لگی۔

''ایشر سنگھ نے اپنی صدری اتار دی اور کلونت کور کو شہوانی نظروں سے دیکھ کر کہا: ''آ جاؤ ایک بازی تاش کی ہو جائے!''

کلونت کور کے بالائی ہونٹ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ آئیں۔ ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھمائیں اور کہا: ''چل، دفان ہو۔''

ایشر سنگھ نے اس کے بھرے ہوئے کولہے پر زور سے چٹکی بھری۔ کلونت کور تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی: ''نہ کر ایشر سیاں، میرے درد ہوتا ہے۔''

ایشر سنگھ نے آگے بڑھ کر کلونت کور کا بالائی ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبا لیا اور کچکچانے لگا۔ کلونت کور بالکل پگھل گئی۔ ایشر سنگھ نے اپنا کرتہ اتار کے پھینک دیا اور کہا: ''لو، پھر ہو جائے ترپ چال۔۔۔۔۔''

کلونت کور اپنے بازو پر ابھرتے ہوئے لال دھبے کو دیکھنے لگی: ''بڑا ظالم ہے تو ایشر سیاں!''

ایشر سنگھ اپنی گھنی کالی موچھوں میں مسکرایا: ''ہونے دے آج ظلم!'' اور یہ کہہ کر اس نے مزید ظلم ڈھانے شروع

کیئے۔کلونت کور کا بالائی ہونٹ دانتوں تلے کچکچایا۔کان کی لووں کو کاٹا۔ابھرے ہوئے سینے کو بھنبھوڑا۔بھرے ہوئے کولہوں پر آواز پیدا کرنیوالے چانٹے مارے۔گالوں کے منہ بھر بھر کے بوسے لیے۔چوس چوس کر اس کا سارا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا۔ کلونت کور تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح ابلنے لگی۔لیکن ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت پیدا نہ کر سکا۔جتنے گر اور جتنے داؤ اسے یاد تھے سب کے سب اس نے پٹ جانے والے پہلوان کی طرح استعمال کیئے پر کوئی کارگر نہ ہوا۔کلونت کور نے جس کے بدن کے سارے تار تن کر خود بخود بج رہے تھے۔غیر ضروری چھیڑ چھاڑ سے تنگ آ کر کہا:'' ایشر سیاں،کافی پھینٹ چکا ہے،اب پتا پھینک!''

یہ سنتے ہی ایشر سنگھ کے ہاتھ سے جیسے تاش کی ساری گڈی نیچے پھسل گئی۔ہانپتا ہوا وہ کلونت کور کے پہلو میں لیٹ گیا اور اس کے ماتھے پر سرد پسینے کے لیپ ہونے لگے۔کلونت کور نے اسے گرمانے کی بہت کوشش کی۔مگر ناکام رہی۔اب تک سب کچھ منہ سے کہے بغیر ہی ہوتا رہا تھا۔لیکن جب کلونت کور کے منتظر بہ عمل اعضا کو سخت ناامیدی ہوئی تو وہ جھلا کر پلنگ سے نیچے اتر گئی۔''

ایشر سنگھ کو ٹھنڈا پا کر کلونت کور کا شک یقین میں بدل گیا۔تب اس کے اندر کی شدت پسند عورت سامنے آ جاتی ہے۔

''ایشر سیاں!وہ کون حرامزادی ہے جس کے پاس تو اتنے دن رہ کر آیا ہے اور جس نے تجھ کو نچوڑ ڈالا ہے؟''

ایشر سنگھ پلنگ پر لیٹا ہانپتا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

کلونت کور غصے سے ابلنے لگی:''میں پوچھتی ہوں'' کون ہے وہ چڑو۔۔۔۔۔کون ہے وہ الفتی۔۔۔۔۔کون ہے وہ چور پتا!''

ایشر سنگھ نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا''کوئی بھی نہیں کلونت،کوئی بھی نہیں۔''

کلونت کور نے اپنے بھرے ہوئے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر ایک عزم کے ساتھ:''ایشر سیاں،میں آج جھوٹ سچ جان کے رہوں گی۔۔۔۔۔واہگورو جی کی قسم۔۔۔۔۔کیا اس تہہ میں کوئی عورت نہیں؟''

ایشر سنگھ نے بڑے دکھ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔کلونت کور بالکل دیوانی ہو گئی۔

لپک کر کونے میں سے کرپان اٹھائی،میان کو کیلے کے چھلکے کی طرح اتار کر ایک طرف پھینکا اور ایشر سنگھ پر وار کر دیا۔ آن کی آن میں لہو کے فوارے چھوٹے پڑے۔کلونت کور کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے وحشی بلیوں کی طرح

ایشر سنگھ کے کیس نوچنے شروع کر دیئے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی نامعلوم سوت کو موٹی موٹی گالیاں دیتی رہی۔''

ایشر سنگھ کے گلے پر کرپان پھیر دینے کے بعد بھی اسے صبر نہیں آیا۔ یہاں اس کی انتہائی خودغرضی بھی سامنے آتی ہے ۔اسے صرف غرض اس سے ہے کہ آخر وہ کون عورت ہے جو اس کے اور ایشر سنگھ کے درمیان میں آ گئی ہے۔

''خون ایشر سنگھ کے گلے سے اڑ اڑ کر اس کی مونچھوں پر گر رہا تھا۔اس نے اپنے لرزاں ہونٹ کھولے اور کلونت کور کی طرف شکریے اور گلے کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھا:''میری جان! تم نے بہت جلدی کی۔۔۔۔۔لیکن جو ہوا ٹھیک ہے۔''

کلونت کور کا حسد پھر بھڑکا:''مگر وہ کون ہے؟ تمہاری ماں!''

لہو ایشر سنگھ کی زبان تک پہنچ گیا۔ جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

''اور میں۔۔۔۔۔اور میں۔۔۔۔۔بھینی یا چھ آدمیوں کا قتل کر چکا ہوں۔۔۔۔۔اس کرپان سے۔۔۔۔۔''

کلونت کور کے دماغ میں صرف دوسری عورت تھی:''میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ حرامزادی؟''

ایشر سنگھ کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ایک ہلکی سی چمک ان میں پیدا ہوئی اور اس نے کلونت کور سے کہا:''گالی نہ دے اس بھڑوی کو۔''

کلونت چلائی:''میں پوچھتی ہوں' وہ ہے کون؟''

ایشر سنگھ کے گلے میں آواز رندھ گئی:''بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اس پر اپنا جیتا جاگتا خون دیکھ کر مسکرایا:''انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔''

کلونت کور اس کے جواب کی منتظر تھی:''ایشر سیاں، تو مطلب کی بات کر!''

ایشر سنگھ کی مسکراہٹ اس لہو بھری مونچھوں میں اور زیادہ پھیل گئی۔۔۔۔۔''مطلب ہی کی بات کر رہا ہوں ۔۔۔۔۔گلا چرا ہے ماں یا میرا۔۔۔۔۔اب دھیرے دھیرے ہی ساری بات بتاؤں گا۔''

اور جب وہ بتانے لگا تو اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کے لیپ ہونے لگے:''کلونت! میری جان۔۔۔۔۔میں تمہیں نہیں بتا سکتا، میرے ساتھ کیا ہوا۔۔۔۔۔انسان کڑی یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔۔۔۔۔شہر میں لوٹ مچی تو سب کی طرح میں نے بھی اس میں حصہ لیا۔۔۔۔۔گہنے پاتے اور روپے پیسے جو بھی ہاتھ لگے وہ میں نے تمہیں دے دیئے ۔۔۔۔۔لیکن ایک بات تمہیں نہ بتائی۔''

ایشر سنگھ نے گھاؤ میں درد محسوس کیا اور کراہنے لگا۔کلونت کور نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور بڑی بے رحمی سے پوچھا:
''کون سی بات؟''

ایشر سنگھ نے مونچھوں پر جمتے ہوئے لہو کو پھونک کے ذریعے سے اڑاتے ہوئے کہا''جس مکان پر۔۔۔۔۔میں نے دھاوا بولا تھا۔۔۔۔۔اس میں سات۔۔۔۔۔اس میں۔۔۔۔۔سات آدمی تھے۔۔۔۔۔چھ میں نے۔۔۔۔۔قتل کر دیئے۔۔۔۔۔اسی کرپان سے جس سے تو نے مجھے۔۔۔۔۔چھوڑ اسے۔۔۔۔۔سن۔۔۔۔۔ایک لڑکی تھی بہت سندر۔۔۔۔۔اسکو اٹھا کر میں اپنے ساتھ لے آیا۔''

کلونت کور خاموشی سے سنتی رہی۔ایشر سنگھ نے ایک بار پھر پھونک مار کے مونچھوں پر سے لہو اڑایا:''کلونت جانی، میں تم سے کیا کہوں کتنی سندر تھی۔۔۔۔۔میں اسے بھی مار ڈالتا، پر میں نے کہا''نہیں، ایشر سیاں،کلونت کور کے تو ہر روز مزے لیتا ہے، یہ میوہ بھی چکھ دیکھ۔''

کلونت کور نے صرف اس قدر کہا''ہوں۔۔۔۔۔''

اور میں اسے کندھے پر ڈال کر چل دیا۔۔۔۔۔راستے میں۔۔۔۔۔کیا کہہ رہا تھا میں۔۔۔۔۔ہاں راستے میں۔۔۔۔۔نہر کی پٹڑی کے پاس،تھوہڑ کی جھاڑیوں تلے میں نے اسے لٹا دیا۔۔۔۔۔پہلے سوچا کہ پھینٹوں،لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں۔۔۔۔۔یہ کہتے کہتے ایشر سنگھ کی زبان سوکھ گئی۔

کلونت کور نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کیا اور پوچھا،''پھر کیا ہوا؟''ایشر سنگھ کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے: میں نے۔۔۔۔۔پتا پھینکا۔۔۔۔۔لیکن۔۔۔۔۔''

اس کی آواز ڈوب گئی۔

کلونت کور نے اسے جھنجوڑا:''پھر کیا ہوا؟''

ایشر سنگھ نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کلونت کور کے جسم کی طرف دیکھا جس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی'' وہ۔۔۔۔۔وہ مری ہوئی تھی۔۔۔۔۔لاش تھی۔۔۔۔۔بالکل ٹھنڈا گوشت۔۔۔۔۔جانی مجھے اپنا ہاتھ دے۔۔۔۔۔''

کلونت کور کو اس وقت پتہ چلتا ہے کہ اس کی شدت پسندی نے ہی ایشر سنگھ کو اس سے دور کر دیا۔کیونکہ ان کے درمیان عورت نہیں ایشر سنگھ کا ضمیر آ گیا تھا۔

''کلونت کور نے اپنا ہاتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ پر رکھا جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔''

(ٹھنڈا گوشت۔ٹھنڈا گوشت)



شانتی

ایک ہندو کال گرل، جو سری نگر سے بمبئی میں وارد ہوئی تھی۔ پہلی بار ساحل سمندر پر موجود ریسٹورنٹ یا ہوٹل پیرے ژین ڈیری پر نظر آتی ہے۔

''مقبول نے ادھر دیکھا۔ایک دبلی پتلی، گوری چٹی لڑکی کرسی پر بیٹھ رہی تھی۔ بال کٹے ہوئے تھے۔ ناک نقشہ ٹھیک تھا۔ ہلکے زرد رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔''

بریدہ بالوں کا رنگ بھوسلا تھا۔ ہلکے بسنتی رنگ کی ساڑھی کے نیچے چھوٹی آستینوں والا بلاؤز پتلی پتلی بہت ہی گوری بانہیں۔لڑکی نے اپنی گردن موڑی تو مقبول نے دیکھا کہ اس کے باریک ہونٹوں پر سرخی پھیلی ہوئی سی تھی۔''

یعنی اس لڑکی کو لپ اسٹک استعمال کرنے کا سلیقہ نہیں تھا، ساڑھی بھی اچھی طرح نہیں پہنی تھی اور بال بھی اچھے انداز سے سنوارے ہوئے نہیں تھے۔

شانتی میں خوبیاں تھیں۔

''سب سے پہلی خوبی اس لڑکی میں یہ ہے کہ بہت صاف گو ہے۔کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ جو اصول اس نے اپنے لیے بنا رکھے ہیں ان پر بڑی پابندی سے عمل کرتی ہے پرسنل ہائی جین کا بہت خیال رکھتی ہے۔محبت وحبت کی بالکل قائل نہیں ۔اس معاملے میں دل اس کا برف ہے۔''

''روکھے پن کی حد تک صاف گو ہے۔اس سے باتیں کرو تو کئی بار دھکے سے لگتے ہیں۔۔۔۔۔ایک گھنٹہ ہو گیا۔تم نے کوئی کام کی بات نہیں کی۔۔۔۔۔ میں چلی اور یہ جا وہ جا۔۔۔۔۔تمہارے منہ سے شراب کی بو آتی ہے، جاؤ چلے

جاؤ۔۔۔۔۔ساڑھی کو ہاتھ مت لگاؤ میلی ہو جائے گی۔''

حالانکہ۔۔۔۔۔!

''جو خوبیاں تم نے بتائی ہیں ایک ایسی عورت میں نہیں ہونی چاہیں جس کے پاس مرد صرف اس خیال سے جاتے ہیں کہ وہ ان سے اصلی نہیں تو مصنوعی محبت ضرور کرے گی۔۔۔۔۔خود فریبی میں اگر یہ لڑکی کسی مجرد کی مدد نہیں کرتی تو میں سمجھتا ہوں بڑی بے وقوف ہے۔''

بمبئ میں اس کا کوئی نہیں تھا۔ وہ وہاں اکیلی رہتی تھی۔ ہار بنی روڈ پر موجود ایک ہوٹل میں اس نے کرائے کا کمرہ لیا ہوا تھا۔ وہ اپنے ٹھکانے کے بارے میں کسی کو نہیں بتاتی تھی۔ جس سے بھی اس نے ملنا ہو یا اپنے دھندے کے لیے نکلنا ہوتو ساحل سمندر پر پیرے ڑین ڈیری آجاتی تھی۔

اس سے پچاس روپے میں معاملہ طے ہو جاتا تھا، لیکن

''تمام واقعات معلوم کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ کچھ اور باتیں ہوئیں جن سے اسے پتا چلا کہ شانتی کو جنسی معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب اس کا ذکر آیا تو اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔'' آئی ڈونٹ لائک۔ یٹ از بیڈ۔''

''اس کو حیرت ہے کہ مرد اس کے پاس کیوں آتے ہیں جبکہ وہ اتنی ٹھنڈی ہے۔''

مقبول اس سے صرف باتیں کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ وہ اسے کھلونا سمجھتا ہے۔ آج اس نے سوچا، مجھ جیسی ساری عورتیں تو نہیں۔ مقبول کو عورت کی ضرورت ہے۔ کیوں نہ وہ اسے ایک منگا دے۔

مقبول نے پہلی بار شانتی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ایک دم وہ اٹھی اور چلانے لگی ''ہم کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔جاؤ چلے جاؤ۔۔۔۔۔ہمارے پاس کیوں آتا ہے تم۔۔۔۔۔جاؤ''

وہ کال گرل کیوں بنی۔۔۔۔۔!

''شانتی نے یہ بے تکلف جواب دیا۔'' میرا فادر سری نگر میں ڈاکٹر ہے۔ میں وہاں ہوسپی ٹل میں نرس تھا۔ ایک لڑکے نے مجھ کو خراب کر دیا۔۔۔۔۔میں بھاگ کر ادھر کو آگئی۔ یہاں ہم کو ایک آدمی ملا۔ وہ ہم کو ففٹی روپیز دیا۔۔۔۔۔بولا ہمارے ساتھ چلو۔ ہم گیا۔ بس کام چالو ہو گیا۔۔۔۔۔ہم یہاں ہوٹل میں آگیا۔۔۔۔۔پر ہم ادھر کسی سے بات نہیں کرتی۔۔۔۔۔سب رنڈی لوگ ہے۔۔۔۔۔کسی کو یہاں نہیں آنے دیتی۔''

''اس کے نزدیک ففٹی روپیز کا معاملہ ایک کاروباری معاملہ تھا۔ سرینگر کے ہسپتال میں جب کسی لڑکے نے اس کو خراب کیا تو جاتے وقت دس روپے دینا چاہے۔ شانتی کو بہت غصہ آیا۔ نوٹ پھاڑ دیا۔ اس واقعے کا اس کے دماغ پر یہ اثر ہوا کہ اس نے باقاعدہ کاروبار شروع کر دیا۔ پچاس روپے فیس خود بخود مقرر ہو گئی۔ اب لذت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا ۔۔۔۔۔ چونکہ نرس رہ چکی تھی اس لیے بڑی محتاط رہتی تھی۔''

وہ صفائی پسند ہونے کے ساتھ ساتھ اس معاملے میں قدرے سنکی تھی۔

''ٹیکسی ایک پانچ منزلہ بلڈنگ کے پاس رکی۔ پہلی اور دوسری منزل پر مساس خانے تھے۔ تیسری، چوتھی اور پانچویں منزل ہوٹل کے لیے مخصوص تھی۔ بڑی تنگ و تاریک جگہ تھی۔ چوتھی منزل پر سیڑھیوں کے سامنے والا کمرہ شانتی کا تھا۔ اس نے پرس سے چابی نکال کر دروازہ کھولا، بہت مختصر سامان تھا۔ لوہے کا ایک پلنگ جس پر اجلی چادر بچھی تھی۔ کونے میں ڈریسنگ ٹیبل۔ ایک اسٹول، اس پر ٹیبل فین۔ چار ٹرنک تھے وہ پلنگ کے نیچے دھرے تھے۔

مقبول کمرے کی صفائی سے بہت متاثر ہوا۔ ہر چیز صاف ستھری تھی۔ تکیے کے غلاف عام طور پر میلے ہوتے ہیں مگر اس کے دونوں تکیے بے داغ غلافوں میں ملفوف تھے۔ مقبول پلنگ پر بیٹھنے لگا تو شانتی نے سے روکا۔ ''نہیں ۔۔۔۔۔ ادھر بیٹھنے کا اجازت نہیں ۔۔۔۔۔ ہم کسی کو اپنے بستر پر نہیں بیٹھنے دیتا۔ کرسی پر بیٹھو'' یہ کہہ کر وہ خود پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مقبول مسکرا کر کرسی پر ٹک گیا۔''

وہ خود اپنی ذات میں ایک الجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اور یہی الجھن اس کی شخصیت میں نظر بھی آتی تھی۔

''کپڑے اس کے پاس کافی تعداد میں اور اچھے تھے۔ یہ سب کے سب اس نے مقبول کو دکھائے۔ اس میں بچپنا تھا نہ بڑھاپا۔ شباب بھی نہیں تھا۔ وہ جیسے کچھ بنتے بنتے ایک دم رک گئی تھی، ایک ایسے مقام پر ٹھہر گئی تھی جس کے موسم کا تعین نہیں ہو سکتا وہ خوبصورت تھی نہ بدصورت، عورت تھی نہ لڑکی۔ وہ پھول تھی نہ کلی۔ شاخ تھی نہ تنا اس کو دیکھ کر بعض اوقات مقبول کو بہت الجھن ہوتی تھی۔ وہ س میں وہ نقطہ دیکھنا چاہتا تھا۔ جہاں اس نے غلط ملط ہونا شروع کیا تھا۔''

روپے کے معاملے میں وہ لاپرواہ واقع ہوئی تھی۔

''ایک برس ہو گیا تھا اسے بمبئی آئے ہوئے۔ اس دوران میں اس نے دس ہزار روپے بچائے ہوتے مگر اس کو ریس کھیلنے کی لت پڑ گئی۔ پچھلی ریسوں پر اس کے پانچ ہزار اڑ گئے لیکن اس کو یقین تھا کہ وہ نئی ریسوں پر ضرور جیتے گی۔ ''ہم اپنا

لوس پورا کر لے گا۔''

اس کے پاس کوڑی کوڑی کا حساب موجود تھا۔سو روپے روزانہ کما لیتی تھی جو فوراً بنک میں جمع کرا دیے جاتے تھے۔ سو سے زیادہ وہ نہیں کمانا چاہتی تھی۔اس کو اپنی صحت کا بہت خیال تھا۔''

جب تک وہ سری نگر سے روح پر زخم کھا کر آنے والی اور بمبئی میں کال گرل تھی۔اس میں روکھا پن، مرد کے لیے بے کشش، لا پرواہ اور خود سے غافل رہنے والی تھی۔لیکن جیسے ہی اس کے اندر کی عورت، کسی مرد کی توجہ پا کر بیدار ہوئی تب فوری طور پر اس تبدیلی سے سمجھوتہ نہیں کر پائی۔

''اس کی کوئی خاطر مدارت نہیں کرتی تھی۔لیکن اب اس نے اس کو اپنے صاف ستھرے بستر پر بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔ایک دن مقبول کو بہت تعجب ہوا۔جب شانتی نے اس سے کہا۔''تم کوئی لڑکی مانگتا؟''

مقبول لیٹا ہوا تھا چونک کر اٹھا۔''کیا کہا؟''

شانتی نے کہا۔''ہم پوچھتی، تم کوئی لڑکی مانگتا تو ہم لا کر دیتا۔''

مقبول نے اس سے دریافت کیا کہ یہ بیٹھے بیٹھے اسے کیا خیال آیا۔کیوں اس نے یہ سوال کیا تو وہ خاموش ہو گئی۔ مقبول نے اصرار کیا تو شانتی نے بتایا کہ مقبول اسے ایک بیکار عورت سمجھتا ہے۔''

شانتی جو ایک عورت ہے، خود سے لا پرواہ، روکھی اور قدرے سنکی۔جب اس کے اندر عورت بیدار ہو جاتی ہے تو پھر وہ اس کے تابع ہو جاتی ہے۔

''متواتر ایک ہفتہ وہ پیرے ڑین ڈیری جاتا رہا۔مگر شانتی دکھائی نہ دی۔آخر ایک صبح اس نے اس کے ہوٹل کا رخ کیا۔شانتی نے دروازہ کھول دیا مگر کوئی بات نہ کی۔مقبول کرسی پر بیٹھ گیا۔۔۔۔۔شانتی کے ہونٹوں پر سرخی بڑنے بھدے طریقے پر لگی تھی۔بالوں کا حال بھی پرانا تھا۔ساڑھی کی پہناوٹ تو اور زیادہ بدزیب تھی۔مقبول اس سے مخاطب ہوا۔مجھ سے ناراض ہو تم؟''

شانتی نے جواب نہ دیا اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔مقبول نے تند لہجے میں پوچھا۔

''بھول گئیں جو میں نے سکھایا تھا؟''

شانتی خاموش رہی۔مقبول نے غصے میں کہا۔''جواب دو ورنہ یاد رکھو ماروں گی۔''

شانتی نے صرف اتنا کہا۔ ''مارو۔''

مقبول نے اٹھ کر ایک زور کا چانٹا اس کے منہ پر جڑ دیا۔۔۔۔۔ شانتی بلبلا اٹھی۔ اس کی حیرت زدہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ مقبول نے جیب سے اپنا رومال نکالا۔ غصے میں اس کے ہونٹوں کی بھدی سرخی پونچھی۔ اس نے مزاحمت کی لیکن مقبول اپنا کام کرتا رہا۔ لپ اسٹک اٹھا کر نئی سرخی لگائی۔ کنگھے سے اس کے بال سنوارے، پھر اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''ساڑھی ٹھیک کر والو اپنی۔''

شانتی اٹھی اور ساڑھی ٹھیک کرنے لگی مگر ایک دم اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا اور روتی روتی خود کو بستر پر گرا دیا۔ مقبول تھوڑی دیر خاموش رہا۔ جب شانتی کے رونے کی شدت کچھ کم ہوئی تو اس کے پاس جا کر کہا۔ ''شانتی اٹھو۔۔۔۔۔ میں جا رہا ہوں۔''

شانتی نے تڑپ کر کروٹ بدلی اور چلائی۔ ''نہیں نہیں۔۔۔۔۔ تم نہیں جا سکتے۔''

وہ ہانپ رہی تھی۔ اس کا سینہ جس کے متعلق مقبول نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا جیسے گہری نیند سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مقبول کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے شانتی نے تلے اوپر بڑی سرعت سے کئی رنگ بدلے۔ اس کی نمناک آنکھیں چمک رہی تھیں۔ سرخی لگے باریک ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ ایک دم آگے بڑھ کر مقبول نے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔''

وہ پکار اٹھتی ہے۔

''ادھر سرینگر میں۔۔۔۔۔ ایک آدمی نے۔۔۔۔۔ ہم کو مار دیا تھا۔۔۔۔۔ ادھر ایک آدمی نے۔۔۔۔۔ ہم کو زندہ کر دیا۔''

اسے اس بات کا پوری طرح احساس ہو جاتا ہے کہ عورت کی صحیح جگہ کہاں ہے۔ اسے کس مقام پر ہونا چاہیے اور اس کی ضرورت کیا ہے۔

''دو گھنٹے کے بعد جب مقبول جانے لگا تو اس نے جیب سے پچاس روپے نکال کر شانتی کے پلنگ پر رکھے اور مسکرا کر کہا۔ ''یہ لو اپنے ففٹی روپیز!''

شانتی نے بڑے غصے اور بڑی نفرت سے نوٹ اٹھائے اور پھینک دیئے۔ پھر اس نے تیزی سے اپنی ڈریسنگ ٹیبل کا

ایک دروازہ کھولا اور مقبول سے کہا۔ ''ادھر آؤ۔۔۔۔۔دیکھو یہ کیا ہے؟''

مقبول نے دیکھا۔ دراز میں سو سو کے کئی نوٹوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ مٹھی بھر کے شانتی نے اٹھائے اور ہوا میں اچھالے ''ہم اب یہ نہیں مانگتا!''

شانتی نے جواب دیا۔ ''تم کو'' یہ کہہ کر وہ مقبول کے ساتھ چمٹ گئی اور رونا شروع کر دیا۔''



شاردا

ایک عام سی ہندو لڑکی جو اچانک ہی مختار کو نظر آ گئی تھی۔ جب وہ کٹا ہوا پتنگ لینے کوٹھے پر گیا۔

''ایک لڑکی ڈونگا ہاتھ میں لیے نہا رہی تھی، مختار کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ لڑکی کہاں سے آ گئی۔ کیونکہ سامنے والے مکان میں کوئی لڑکی نہیں تھی۔ جو تھیں۔ بیاہی جا چکی تھیں۔ صرف روپ کور تھی۔ اس کا پلپلا خاوند کالو مل تھا۔ ان کے تین لڑکے تھے اور بس۔''

مختار کے سامنے وہ لڑکی ایک کھلی کتاب کی مانند تھی۔

''لڑکی بہت خوبصورت تھی اس کے ننگے بدن پر سنہرے روئیں تھے۔ ان میں پھنسی ہوئی پانی کی ننھی ننھی بوندنیاں چمک رہی تھیں۔ اس کا رنگ ہلکا سانولا تھا، سانولا بھی نہیں۔ تانبے کے رنگ جیسا، پانی کی ننھی ننھی بوندنیاں ایسی لگتی تھیں جیسے اس کا بدن پگھل کر قطرے قطرے بن کر گر رہا ہے۔

مختار نے جھرنے کے سوراخوں کے ساتھ اپنی آنکھیں جما دیں اور اس لڑکی کے، جو ڈونگا ہاتھ میں لیے نہا رہی تھی دلچسپی اور غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔''

''اس کی عمر زیادہ سے زیادہ سولہ برس کی تھی۔ گیلے سینے پر اس کی چھوٹی چھوٹی گول چھاتیاں جن پر پانی کے قطرے پھسل رہے تھے۔ بڑی دلفریب تھیں۔ اس کو دیکھ کر مختار کے دل و دماغ میں سفلی جذبات پیدا نہ ہوئے۔ ایک جوان،

خوبصورت اور بالکل ننگی لڑکی اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔''

''لڑکی کے نچلے ہونٹ کے اختتامی کونے پر بڑا سا تل تھا۔۔۔۔۔ بے حد متین، بے حد سنجیدہ، جیسے وہ اپنے وجود سے بے خبر ہے، لیکن دوسرے اس کے وجود سے آگاہ ہیں۔ صرف اس حد تک کہ اسے وہیں ہونا چاہیے تھا جہاں کہ وہ تھا۔

بانہوں پر سنہرے روئیں پانی کی بوندوں کے ساتھ لپٹے ہوئے چمک رہے تھے اس کے سر کے بال سنہرے نہیں، بھوسلے تھے جنہوں نے شاید سنہرے ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ جسم سڈول اور گدرایا ہوا تھا لیکن اس کو دیکھنے سے اشتعال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مختار دیر تک جھرنے کے ساتھ آنکھیں جمائے رہا۔''

مختار اس کے حسن میں ہی ڈوب کر رہ گیا۔ ایسا کہ اسے خود اپنا ہوش نہیں رہا۔

''ہونا یہ چاہیے تھا کہ مختار کے اندر شہوانی ہیجان برپا ہو جاتا۔ مگر وہ بڑے ٹھنڈے انہماک سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے کسی مصور کی تصویر دیکھ رہا ہے۔''

''لڑکی نے بدن پر صابن ملا۔ مختار تک اس کی خوشبو پہونچی۔ سلونے، تانبے جیسے رنگ والے بدن پر سفید سفید جھاگ بڑے سہانے معلوم ہوتے تھے۔ پھر جب یہ جھاگ پانی کے بہاؤ سے پھسلے تو مختار نے محسوس کیا۔ جیسے اس لڑکی نے اپنا بلبلوں کا لباس بڑے اطمینان سے اتار کر ایک طرف رکھ دیا ہے۔''

شاردا کی نظر جب مختار پر پڑی تو۔۔۔۔۔۔

''غسل سے فارغ ہو کر لڑکی نے تولئے سے اپنا بدن پونچھا۔ بڑے سکون اور اطمینان سے آہستہ آہستہ کپڑے پہنے۔ کھڑکی کے ڈنڈے پر دونوں ہاتھ رکھے اور سامنے دیکھا۔''

''ایک دم اس کی آنکھیں شرماہٹ کی جھیلوں میں غرق ہو گئیں اس نے کھڑکی بند کر دی۔ مختار بے اختیار ہنس پڑا۔

لڑکی نے فوراً کھڑکی کے پٹ کھولے اور بڑے غصے میں جھرنے کی طرف دیکھا۔ مختار نے کہا۔ ''میں قصوروار بالکل نہیں۔۔۔۔۔ آپ کیوں کھڑکی کھول کر نہار ہی تھیں۔''

لڑکی نے کچھ نہ کہا۔ غیض آلود نگاہوں سے جھرنے کو دیکھا اور کھڑکی بند کر لی۔''

اس واقعہ کے چوتھے دن وہ مختار کے گھر گئی۔

''چوتھے دن روپ کور آئی۔ اس کے ساتھ یہی لڑکی تھی۔ مختار کی ماں اور بہن دونوں سلائی اور کروشیے کے کام کی ماہر

تھیں، گلی کی اکثر لڑکیاں ان سے یہ کام سیکھنے کے لیے آیا کرتی تھیں۔ روپ کور بھی اس لڑکی کو اسی غرض سے لائی تھی کیونکہ اس کو کروشیے کے کام کا بہت شوق تھا۔ مختار اپنے کمرے سے نکل کر صحن میں آیا تو اس نے روپ کور کو پر نام کیا۔ لڑکی پر اس کی نگاہ پڑی تو وہ سمٹ سی گئی۔ مختار مسکرا کر وہاں سے چلا گیا۔''

گزرتے دنوں کے ساتھ مختار اور شاردا میں جو اک حجاب تھا۔ وہ ختم ہوتا چلا گیا اسی دوران مختار کو معلوم ہوا کہ اس کا نام شاردا تھا۔ روپ کور کے چچا کی لڑکی تھی یتیم تھی۔ چیچو کی ملیاں میں ایک غریب رشتہ دار کے ساتھ رہتی تھی۔ روپ کور نے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔ انٹرنس پاس تھی۔ بڑی ذہین تھی، کیونکہ اس نے کروشیے کا مشکل کام یوں چٹکیوں میں سیکھ لیا تھا۔''

شاردا ایک ایسی لڑکی ثابت ہوئی جسے دیکھ کر مختار کے دل کی دنیا بدل کر رہ گئی اور وہ اپنے خیالوں اور جذبات میں اسی کو محسوس کرنے لگا۔ اس نے شاردا کو کئی طرح سے سوچا۔

''مختار نے کئی دفعہ سوچا تھا کہ یہ محبت کا معاملہ بالکل غلط ہے، اس لیے کہ شاردا ہندو ہے۔ مسلمان کیسے ایک ہندو لڑکی سے محبت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔''

پھر مختار اور شاردا کے درمیان وہ تعلق بن گیا جو ذہنی ہم آہنگی کے باعث اٹھتی ہوئی جوانیوں میں لڑکے اور لڑکی کے درمیان بن جاتے ہیں۔

''مختار نے بڑی جرأت سے کام لیا۔ آگے بڑھا۔ اس کی ایک کلائی پکڑی اور کھینچ کر اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ مختار اور شاردا دونوں کو ایک لحظے کے لیے بالکل پتا نہ چلا کہ کیا ہوا ہے۔۔۔۔۔ اس کے بعد دونوں لرز گئے۔''

مختار اپنی حرکت اور اس کے نتائج بھول گیا۔ اس نے ایک بار پھر شاردا کو اپنی طرف کھینچا اور سینے کے ساتھ بھینچ لیا ۔۔۔۔۔ شاردا نے مزاحمت نہ کی۔ وہ صرف مجسمہ حیرت بنی ہوئی تھی۔ وہ ایک سوال بن گئی تھی ۔۔۔۔۔ ایک ایسا سوال جو اپنے آپ سے کیا گیا ہو۔''

آہستہ آہستہ مختار اور شاردا دونوں شیر و شکر ہو گئے ۔ تنہائی کا موقعہ ملتا تو دیر تک پیار محبت کی باتیں کرتے رہتے! ۔۔۔۔۔ ایک دن روپ کور اور اس کا خاوند لالہ کالومل کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ مختار گلی میں سے گزر رہا تھا کہ اس کو

ایک کنکر لگا۔ اس نے اوپر دیکھا شاردا تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔''

''مختار نے اس سے کہا'' اس روز مجھ سے گستاخی ہوئی تھی اور میں معافی مانگ لی تھی۔ آج پھر گستاخی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، لیکن معافی نہیں مانگوں گا، اور اپنے ہونٹ شاردا کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔''

شاردا کی شدت سے مختار کو اس قدر جرأت ہوگئی کہ وہ اس کے بدن پر اپنا حق سمجھنے لگا۔

''جی نہیں۔۔۔۔۔ اب یہ ہونٹ آپ کے نہیں۔۔۔۔۔ میرے ہیں۔۔۔۔۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں۔''

مختار اسکے لیے پوری طرح سنجیدہ ہو گیا اور اسے دل و جان سے چاہنے لگا۔ جس کا اظہار اس نے اپنی پوری شدتوں سے کر دیا۔

''مختار نے کئی دفعہ سوچا تھا کہ یہ محبت کا معاملہ بالکل غلط ہے، اس لیے کہ شاردا ہندو ہے۔ مسلمان کیسے ایک ہندو لڑکی سے محبت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ مختار نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا لیکن وہ اپنے محبت کے جذبے کو مٹا نہ سکا۔''

''مختار کو اس کا یہ سکوت بہت پریشان کن محسوس ہوا'' بولو شاردا۔۔۔۔۔ اگر تمہیں میری یہ حرکت بری لگی ہے تو کہہ دو۔۔۔۔۔ خدا کی قسم میں معافی مانگ لوں گا۔ تمہاری طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھوں گا میں نے کبھی ایسی جرأت نہ کی ہوتی، لیکن جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ دراصل۔۔۔۔۔ دراصل مجھے تم سے محبت ہے۔''

''مختار خوشی سے اچھل پڑا۔'' دھرم ورم کو چھوڑو۔۔۔۔۔ پریم کے دھرم میں سب ٹھیک ہے۔''

شاردا ہنسی۔۔۔۔۔ مختار کا جی چاہا کہ وہ اپنی ساری عمر اس ہنسی کی چھاؤں میں گزار دے؟ شاردا، خدا کی قسم، تم ہنستی ہو تو میرا رواں رواں شادماں ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ تم کیوں اتنی پیاری ہو؟۔۔۔۔۔ کیا دنیا میں کوئی اور لڑکی بھی تم جتنی پیاری ہوگی۔۔۔۔۔ یہ کم بخت جھرنے۔۔۔۔۔ یہ مٹی کے ذلیل پردے۔ جی چاہتا ہے ان کو توڑ پھوڑ دوں۔''

شاردا پھر ہنسی۔ مختار نے کہا۔'' یہ ہنسی کوئی اور نہ دیکھے، کوئی اور نہ سنے۔ شاردا صرف میرے سامنے ہنسنا۔۔۔۔۔ اور اگر کبھی ہنسنا ہو تو مجھے بلا لیا کرو۔۔۔۔۔ میں اس کے اردگرد اپنے ہونٹوں کی دیواریں کھڑی کر دوں گا۔'' شاردا نے بھی اس کی جرأتوں کا جواب بھرپور چاہتوں سے دیا۔

''مختار ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔'' دیکھو شاردا ہم اس وقت ایک آتش فشاں پہاڑ پر کھڑے ہیں۔ تم سوچ لو، سمجھ لو۔۔۔۔۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے سوا میری زندگی میں اور کوئی عورت نہیں آئے گی

۔۔۔۔۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ زندگی بھر میں تمہارا رہوں گا۔ میری محبت ثابت قدم رہے گی۔۔۔۔۔ کیا تم بھی اس کا عہد کرتی ہو!''

شاردا نے اپنی نگاہیں اٹھا کر مختار کی طرف دیکھا۔''میرا پریم سچا ہے؟''

مختار نے اس کو سینے کے ساتھ بھینچ لیا اور کہا۔''زندہ رہو۔۔۔۔۔ صرف میرے لیے، میری محبت کے لیے وقف رہو ۔۔۔۔۔ خدا کی قسم شاردا۔ اگر تمہارا التفات مجھے نہ ملتا تو میں یقیناً خوکشی کر لیتا۔۔۔۔۔ تم میری آغوش میں ہو، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری دنیا کی خوشیوں اسے میری جھولی بھری ہوئی ہے۔ میں بہت خوش نصیب ہوں۔''

شاردا نے اپنا سر مختار کے کندھے پر گرا دیا۔'' آپ باتیں کرنا جانتے ہیں۔۔۔۔۔ مجھ سے اپنے دل کی بات نہیں کہی جاتی۔''

''مختار نے بڑھ کر اس کی آنکھیں چومیں۔''اس روز میں جب یہاں سے گیا تو ساری رات سوچتا رہا۔۔۔۔۔ جو کچھ اس روز ہوا اس کے بعد یہ سوچ بچار لازمی تھی۔ ہماری حیثیت میاں بیوی کی تھی۔ میں نے غلطی کی۔ تم نے کچھ نہ سوچا۔۔۔۔۔ ہم نے ایک ہی جست میں کئی منزلیں طے کر لیں اور یہ غور ہی نہ کیا کہ ہمیں جانا کس طرف ہے۔۔۔۔۔ سمجھ رہی ہو نا شاردا۔''

شاردا نے آنکھیں جھکا لیں۔''جی ہاں۔''

مختار اور شاردا اگر چہ ایک ہی جست میں کئی منزلیں طے کر گئے تھے۔ اس پر مختار نے پوری سنجیدگی سے سوچا۔ شاردا نے اپنا سب کچھ مختار کے حوالے کر دیا اور اسے اپنانے کا فیصلہ کر لیا اور اس پر عمل بھی کر ڈالا۔

''میں کلکتے اس لیے گیا تھا کہ ابا جی سے مشورہ کروں۔ تمہیں سن کر خوشی ہوگی کہ میں نے ان کو راضی کر لیا ہے۔'' مختار کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ شاردا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس نے کہا۔''میرے دل کا سارا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ میں اب تم سے شادی کر سکتا ہوں۔''

شاردا نے ہولے سے کہا۔''شادی؟''

''ہاں شادی۔''

اس کے لیے مختار نے تمام تر طوفانوں کو ذہن میں رکھ کر پورے خلوص سے سارا بندوبست کر لیا تھا

''مجھے معلوم ہے کہ تمہارے گھر والے بڑا ہنگامہ مچائیں گے لیکن میں نے اس کا انتظام کرلیا ہے۔ہم دونوں یہاں سے غائب ہوجائیں گے سیدھے کلکتے چلیں گے۔باقی کام اباجی کے سپرد ہے۔جس روز وہاں پہنچیں گے اسی روز مولوی بلا کر تمہیں مسلمان بنادیں گے۔شادی بھی اسی وقت ہوجائے گی۔''

لیکن شاردا کو شادی کے فیصلے پر ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی۔اس کے اندر کی ہندو عورت پوری انگڑائی لے کر جاگ اٹھی۔جو ہندو ہونے کے باوجود اپنا آپ تو سپرد کرسکتی ہے لیکن مذہب کی بنیاد پر اس سے شادی نہیں کرسکتی۔''شاردا نے بمشکل اتنا کہا''تم ہندو ہوجاؤ۔''

''میں ہندو ہوجاؤں؟''مختار کے لہجے میں حیرت تھی۔وہ ہنسا''میں ہندو کیسے ہوسکتا ہوں۔''''میں کیسے مسلمان ہو سکتی ہوں۔''شاردا کی آواز مدھم تھی۔''

مختار نے اپنی آخری کوشش کی۔''مختار نے اپنے خشک حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکالے''ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔شاردا تم ناراض کیوں ہوگئیں؟''

جس کے ردعمل پر محبت دھواں ہوجاتی ہے اور وہاں رہ جاتا ہے مذہب۔۔۔۔!

''جاؤ۔۔۔۔۔چلے جاؤ۔۔۔۔۔ہمارا ہندو مذہب بہت برا ہے۔۔۔۔۔تم مسلمان بہت اچھے ہو''شاردا کے لہجے میں نفرت تھی۔''

اور شاردا نے اپنی اور مختار کی محبت کے درمیان مذہب کی دیوار کھڑی کردی۔حالانکہ وہ اپنا آپ پہلے ہی اس کے سپرد کرچکی تھی۔ (خالی بوتلیں خالی ڈبے۔دوقومیں)



محمودہ

محمودہ۔۔۔۔!جسے حالات کی ہوائیں اک مرکز سے نجانے کن اندھیری راہوں میں لاپھینکتی ہیں۔اس کردار کو

زندگی میں بند گلیوں ہی سے سابقہ پڑتا رہا۔ان مسدود راہوں کی بھل بھلیوں میں سے جب راستہ نکلا تو وہ جہاں تھی اسے خود ہوش نہیں تھا۔

محمودہ کا کردار ایک شخص مستقیم کے مشاہدے میں سے دھواں بن کر نکلتا ہے اور پھر مجسم ہو کر اپنا وجود منوا لیتا ہے۔ مستقیم ہی کا زاویہ نگاہ محمودہ کے کردار کی مختلف پرتیں پیش کرتا چلا جاتا ہے۔

''مستقیم نے محمودہ کو پہلی مرتبہ اپنی شادی پر دیکھا۔آرسی مصحف کی رسم ادا ہو رہی تھی کہ اچانک اس کو دو بڑی بڑی ۔۔۔۔۔غیر معمولی طور پر بڑی آنکھیں دکھائی دیتی ہیں۔۔۔۔۔یہ محمودہ کی آنکھیں تھیں جو ابھی تک کنواری تھیں۔ مستقیم عورتوں اور لڑکیوں کے جھرمٹ میں گھرا تھا۔۔۔۔۔محمودہ کی آنکھیں دیکھنے کے بعد اسے قطعاً احساس نہ ہوا کہ آرسی مصحف کی رسم کب شروع ہوئی اور کب ختم ہوئی۔اس کی دلہن کیسی تھی۔ یہ بتانے کے لیے اس کو موقع دیا گیا تھا،مگر محمودہ کی آنکھیں،اس کی دلہن اور اس کے درمیان ایک سیاہ مخملیں پردے کے مانند حائل ہو گئیں۔''

''لباس بہت معمولی قسم کا تھا۔دوپٹہ جب اس کے سر سے ڈھلکا اور فرش تک جا پہنچا تو مستقیم نے دیکھا کہ اس کا سینہ بہت ٹھوس اور مضبوط تھا۔بھرا بھرا جسم،تیکھی ناک،چوڑی پیشانی،چھوٹا سا لب دہان۔۔۔۔۔اور آنکھیں۔۔۔۔۔جو دیکھنے والے کو سب سے پہلے دکھائی دیتی تھی۔''

محمودہ کی آنکھیں اس قدر خوبصورت تھیں کہ وہی اس کی پہچان بن گئی تھیں۔

''مستقیم کو محمودہ کا نام معلوم نہیں تھا۔۔۔۔۔ایک دن اس نے اپنی بیوی کلثوم سے بر سبیل تذکرہ پوچھا''وہ لڑکی کون تھی ہماری شادی پر۔۔۔۔۔جب آرسی مصحف کی رسم ادا ہو رہی تھی،وہ ایک کونے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی؟''

کلثوم نے جواب دیا''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔۔۔۔۔اس وقت کئی لڑکیاں تھیں۔معلوم نہیں آپ کس کے متعلق پوچھ رہے ہیں۔''

مستقیم نے کہا''وہ۔۔۔۔۔وہ،جس کی یہ بڑی بڑی آنکھیں تھیں؟''

کلثوم سمجھ گئی۔''اوہ۔۔۔۔۔آپ کا مطلب محمودہ سے ہے۔۔۔۔۔ہاں واقعی اس کی آنکھیں بہت بڑی ہیں،لیکن بری نہیں لگتیں۔۔۔۔۔غریب گھرانے کی لڑکی ہے۔بہت کم گو اور شریف۔۔۔۔۔کل ہی اس کی شادی ہوئی ہے۔''

مستقیم کو غیر ارادی طور پر ایک جھٹکا سا لگا۔''اس کی شادی ہو گئی کل؟''

''ہاں۔۔۔۔۔میں کل وہیں تو گئی تھی۔۔۔۔۔میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ میں نے اس کو ایک انگوٹھی دی ہے؟''

''ہاں ہاں۔۔۔۔۔مجھے یاد آ گیا۔۔۔۔۔لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم جس سہیلی کی شادی پر جا رہی ہو، وہی لڑکی ہے، بڑی بڑی آنکھوں والی۔۔۔۔۔کہاں شادی ہوئی ہے اس کی؟''

کلثوم نے گلوری بنا کر اپنے خاوند کو دیتے ہوئے کہا ''اپنے عزیزوں میں۔۔۔۔۔خاوند اس کا ریلوے ورکشاپ میں کام کرتا ہے، ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہے۔۔۔۔۔سنا ہے بے حد شریف آدمی ہے۔''

مستقیم نے گلوری کلے کے نیچے دبائی ''چلو اچھا ہو گیا۔۔۔۔۔لڑکی بھی جیسا کہ تم کہتی ہو شریف ہے۔''

کلثوم سے نہ رہا گیا۔ اسے تعجب تھا کہ اس کا خاوند محمودہ میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے ''حیرت ہے کہ آپ نے اس کو محض ایک نظر دیکھنے پر بھی یاد رکھا۔''

مستقیم نے کہا ''اس کی آنکھیں کچھ ایسی ہیں کہ آدمی انہیں بھول نہیں سکتا۔۔۔۔۔کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟''

محمودہ کی شادی ہو گئی لیکن۔۔۔۔۔

''ایک دن کلثوم ہی نے اس سے کہا ''آپ کی بڑی بڑی آنکھوں والی محمودہ کے نصیب بہت برے نکلے۔''

چونک کو مستقیم نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا ''کیوں۔۔۔۔۔؟ کیا ہوا؟''

کلثوم نے گلوری بناتے ہوئے کہا ''اس کا خاوند ایک دم مولوی ہو گیا ہے۔''

''تو اس سے کیا ہوا؟''

''آپ سن تو لیجئے۔۔۔۔۔ہر وقت مذہب کی باتیں کرتا رہتا ہے۔۔۔۔۔لیکن بڑی اوٹ پٹانگ قسم کی۔ وظیفے کرتا ہے، چلے کاٹتا ہے اور محمودہ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بھی ایسا ہی کرے۔ فقیروں کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے۔ گھر بار سے بالکل غافل ہو گیا ہے۔۔۔۔۔داڑھی بڑھا لی ہے۔ ہاتھ میں ہر وقت تسبیح ہوتی ہے۔ کام پر کبھی جاتا ہے، کبھی نہیں جاتا۔۔۔۔۔کئی کئی دن غائب رہتا ہے۔۔۔۔۔وہ بے چاری کڑھتی رہتی ہے۔ گھر میں کھانے کو کچھ ہوتا نہیں، اس لیے فوقیت کرتی ہے۔ جب اس سے شکایت کرتی ہے تو آگے سے جواب یہ ملتا ہے۔۔۔۔۔فاقہ کشی اللہ تبارک تعالیٰ کو بہت پیاری ہے۔''

کلثوم نے یہ سب کچھ ایک سانس میں کہا۔

مستقیم نے پندنیا سے تھوڑی سی چھالیا اٹھا کر منہ میں ڈالی ''کہیں دماغ تو نہیں چل گیا اس کا؟''

کلثوم نے کہا ''محمودہ کا تو یہی خیال ہے۔۔۔۔۔خیال کیا' اس کو یقین ہے۔ گلے میں بڑے بڑے منکوں والی مالا ڈالے پھرتا ہے۔ کبھی کبھی سفید رنگ کا چولا بھی پہنتا ہے۔''

مستقیم گلوری لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور آرام سے کرسی میں لیٹ کر سوچنے لگا۔ ''یہ کیا ہوا۔۔۔۔۔ایسا شوہر تو وبال جان ہوتا ہے۔۔۔۔۔غریب کس مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ پاگل پن کے جراثیم اس کے شوہر میں شروع ہی سے موجود ہوں گے جو اب ایک دم ظاہر ہوئے ہیں۔۔۔۔۔لیکن سوال یہ ہے اب محمودہ کیا کرے گی۔ اس کا یہاں کوئی رشتہ دار بھی نہیں۔ کچھ شادی کرنے لاہور سے آئے تھے اور واپس چلے گئے تھے۔۔۔۔۔کیا محمودہ نے اپنے والدین کو لکھا ہوگا؟۔۔۔۔۔نہیں نہیں، اس کے ماں باپ تو جیسا کہ کلثوم نے ایک مرتبہ کہا تھا، اس کے بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ شادی اس کے چچا نے کی تھی۔۔۔۔۔ڈونگری۔۔۔۔۔ڈونگری میں شاید اس کی جان پہچان کا کوئی ہو۔۔۔۔۔نہیں، جان پہچان کا کوئی ہوتا تو وہ فاقے کیوں کرتی۔''

مستقیم نے ایک بار ارادہ کیا کہ وہ محمودہ کے متعلق نہیں سوچے گا، اس لیے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بیکار کی مغز پاشی تھی۔

بہت دنوں کے بعد کلثوم نے ایک روز اسے بتایا کہ محمودہ کا شوہر جس کا نام جمیل تھا قریب قریب پاگل ہوگیا ہے۔

مستقیم نے پوچھا ''کیا مطلب؟''

کلثوم نے جواب دیا ''مطلب یہ کہ اب وہ رات کو ایک سیکنڈ کے لیے نہیں سوتا۔ جہاں کھڑا ہے بس وہیں گھنٹوں خاموش کھڑا رہتا ہے۔۔۔۔۔محمودہ غریب روتی رہتی ہے۔۔۔۔۔میں کل اس کے پاس گئی تھی۔ بے چاری کو کئی دن کا فاقہ تھا، میں بیس روپے دے آئی، کیونکہ میرے پاس اتنے ہی تھے۔''

مستقیم نے کہا ''بہت اچھا کیا تم نے۔۔۔۔۔جب تک اس کا خاوند ٹھیک نہیں ہوتا کچھ نہ کچھ دے آیا کرو۔ تاکہ غریب کو فاقوں کی نوبت تو نہ آئے۔''

کلثوم نے تھوڑے توقف کے بعد عجیب و غریب لہجے میں کہا ''اصل میں بات کچھ اور ہے۔''

''کیا بات ہے؟''

''محمودہ کا خیال ہے کہ جمیل نے محض ایک ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ وہ پاگل واگل ہرگز نہیں۔۔۔۔۔ بات یہ ہے کہ وہ ۔۔۔۔۔''

''وہ کیا؟''

''وہ۔۔۔۔۔عورت کے قابل نہیں۔۔۔۔۔ یہ نقص دور کرنے کے لیے وہ فقیروں اور سنیاسیوں سے ٹونے ٹوٹکے لیتا رہتا ہے۔''

مستقیم نے کہا ''یہ بات تو پاگل ہونے سے زیادہ افسوسناک ہے۔۔۔۔۔محمودہ کے لیے تو یہ سمجھو کہ ازدواجی زندگی ایک خلا بن کر رہ گئی ہے!''

مستقیم اپنے کمرے میں چلا گیا اور بیٹھ کر محمودہ کی حالت زار کے متعلق سوچنے لگا۔ ایسی عورت کی زندگی کیا ہو گی جس کا شوہر بالکل صفر ہو۔۔۔۔۔ کتنے ارمان ہوں گے اس کے سینے میں۔ اس کی جوانی نے کتنے کپکپا دینے والے خواب دیکھے ہوں گے۔ اس نے اپنی سہیلیوں سے کیا کچھ نہیں سنا ہوگا۔۔۔۔۔اس نے اپنی گود ہری ہونے کے متعلق بھی کئی بار سوچا ہوگا ۔۔۔۔۔ جب ڈنگری میں کسی کے ہاں بچہ پیدا ہونے کی اطلاع اسے ملتی ہو تو بے چاری کے دل پر ایک گھونسہ سا لگتا ہو گا۔۔۔۔۔اب کیا کرے گی۔۔۔۔۔ایسا نہ ہو خودکشی کر لے۔۔۔۔۔ دو برس تک اس نے کسی کو یہ راز نہ بتایا مگر اس کا سینہ پھٹ پڑا۔ خدا اس کے حال پر رحم کرے۔''

حالات کی مجبوریاں اسے ایک ایسے مقام پر لے آئی، جہاں معاشرتی قدریں شیشے کی طرح چکنا چور ہو جاتی ہیں۔

''ایک دن اس کی سہیلی جو محمودہ کو جانتی تھی، اس کو مبارکباد دینے کے لیے آئی۔ اس نے باتوں باتوں میں کلثوم سے کہا ''کچھ سنا تم نے۔۔۔۔۔ وہ محمودہ ہے نا، بڑی آنکھوں والی؟''

کلثوم نے کہاں ''ہاں ہاں۔۔۔۔۔ ڈونگری میں رہتی ہے۔''

''خاوند کی بے پروائی نے غریب کو بری باتوں پر مجبور کر دیا ہے۔'' کلثوم کی سہیلی کی آواز میں درد تھا

کلثوم نے بڑے دکھ سے پوچھا ''کیسی بری باتوں پر؟''

''اب اس کے یہاں غیر مردوں کا آنا جانا ہو گیا ہے۔''

''جھوٹ۔'' کلثوم کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

کلثوم کی سہیلی نے کہا ''نہیں کلثوم، میں جھوٹ نہیں کہتی۔۔۔۔۔ میں پرسوں اس سے ملنے گئی تھی۔ دروازے پر دستک دینے ہی والی تھی کہ اندر سے ایک نوجوان مرد جو میمن معلوم ہوتا تھا، باہر نکلا اور تیزی سے نیچے اتر گیا۔ میں نے اب اس سے ملنا مناسب نہ سمجھا اور واپس چلی آئی۔''

''یہ تم نے بہت بری خبر سنائی۔۔۔۔۔ خدا اس کو گناہ کے راستے سے بچائے رکھے۔۔۔۔۔ ہوسکتا ہے کہ وہ میمن اس کے خاوند کا کوئی دوست ہو۔'' کلثوم نے خود کو فریب دیتے ہوئے کہا۔

اس کی سہیلی مسکرائی ''دوست، چوروں کی طرح دروازہ کھول کر بھاگا نہیں کرتے۔''

پھر محمودہ ایک نئے روپ میں مستقیم کے سامنے آتی ہے۔

''قریب قریب دو برس گذر گئے۔ ایک دن گھر سے نکل کر مستقیم ایسے ہی تفریحاً فٹ پاتھ پر چہل قدمی کر رہا تھا کہ اس نے قصائیوں کی بلڈنگ کی گراؤنڈ فلور کی کھولی کے باہر تھڑے پر محمودہ کی آنکھوں کی جھلک دیکھی۔ مستقیم دو قدم آگے نکل گیا تھا۔ فوراً مڑ کر اس نے غور سے دیکھا۔۔۔۔۔ محمودہ ہی تھی۔ وہی بڑی بڑی آنکھیں۔۔۔۔۔ وہ ایک یہودن کے ساتھ جو اس کھولی میں رہتی تھی، باتیں کرنے میں مصروف تھی۔

اس یہودن کو سارا ماہم جانتا تھا۔ ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کا کام عیاش مردوں کے لیے جوان لڑکیاں مہیا کرنا تھا۔ اس کی دو جوان لڑکیاں تھیں جن سے وہ پیشہ کراتی تھی۔۔۔۔۔ مستقیم نے جب محمودہ کا چہرہ نہایت ہی بے ہودہ طور پر میک اپ کیا ہوا دیکھا تو وہ لرز اٹھا۔ زیادہ دیر تک یہ اندوہناک منظر دیکھنے کی تاب اس میں نہیں تھی۔۔۔۔۔ وہاں سے فوراً چل دیا۔''

محمودہ۔۔۔۔۔! جس کا کوئی نہیں تھا۔ اور تقسیم ہند نے جہاں زندگیوں میں بڑے بڑے خلا بھر دیئے، وہاں محمودہ ایک مرتبہ پھر کراچی کے ماحول میں ابھرتی ہے۔

''ڈھائی برس کے بعد یہ کاروبار ترقی کر گیا، اس لیے مستقیم نے ملازمت کا خیال ترک کر دیا۔۔۔۔۔ ایک روز شام کو دکان سے اٹھ کر وہ ٹہلتا ٹہلتا صدر جا نکلا۔۔۔۔۔ جی چاہا کہ ایک پان کھائے۔ بیس تیس قدم کے فاصلے پر اسے ایک دکان نظر آئی جس پر کافی بھیڑ تھی۔ آگے بڑھ کر وہ دکان کے پاس پہنچا۔۔۔۔۔ کیا دیکھتا ہے کہ محمودہ بیٹھی پان لگا رہی ہے۔

جھسلے ہوئے چہرے پر اسی قسم کا فحش میک اپ ہے۔ لوگ اسے گندے گندے مذاق کر رہے ہیں اور وہ ہنس رہی ہے ۔۔۔۔۔مستقیم کے ہوش وحواش غائب ہو گئے۔قریب تھا کہ وہاں سے بھاگ جائے کہ محمودہ نے اسے پکارا''ادھر آؤ دلہا میاں۔۔۔۔۔تمہیں ایک فسٹ کلاس پان کھلائیں۔۔۔۔۔ہم تمہاری شادی میں شریک تھے!''مستقیم بالکل پتھرا گیا۔''



جانکی

جانکی۔۔۔۔۔!مختلف خانوں میں بٹی ہوئی ایک عورت۔ایسی عورت جو اپنے مدار سے نکل کر دور خلاؤں میں بکھر گئی تھی۔ جو مرکز کی تلاش میں اپنی ٹوٹ پھوٹ سے بے خبر تھی۔اس کی زندگی کے مختلف پہلو تین مردوں کے توسط سے سامنے آتے ہیں۔

۱۔عزیز

۲۔سعید

۳۔نرائن

پشاور کی رہنے والی جانکی، بمبئی سے ہو کر پونا آتی ہے۔تا کہ یہاں فلمی دنیا میں اسے کوئی کام مل سکے۔اسے عزیز نے بھیجا تھا جس سے جانکی بہت محبت کرتی ہے۔

جانکی، پونا میں چند دن رہی۔ان دنوں میں جانکی کے کردار بارے چند پہلو نمایاں ہوئے۔

پلیٹ فارم پر اور ہوٹل میں تھکاوٹ کے باوجود وہ جاندار عورت تھی مگر جونہی وہ اس کمرے میں جہاں میں صرف بنیان اور پاجامہ پہنے چائے پی رہا تھا داخل ہوئی تو اس کی طرف دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی بہت ہی پریشان اور خستہ حال عورت مجھ سے ملنے آئی ہے۔

جب میں نے اسے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا تو وہ زندگی سے بھرپور تھی لیکن جب پربھات نگر کے نمبر گیارہ فلیٹ میں

آئی تو مجھے محسوس ہوا کہ یا تو اس نے خیرات میں اپنا دس پندرہ اونس خون دے دیا ہے یا اس کا اسقاط ہو گیا ہے۔''

''اس نے اضطراب سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے چائے والی پیالی اٹھائی اور پینا شروع کی اس کی داہنی ٹانگ بڑے زور سے ہل رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی کپکپاہٹ سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن ہچکچاتی ہے۔ میں نے سوچا شاید ہوٹل میں رات کو کسی مسافر نے اسے چھیڑا ہے چنانچہ میں نے کہا: ''آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ہوٹل میں؟''

''جی، جی نہیں!''

میں یہ مختصر جواب سن کر خاموش رہا۔ چائے ختم ہوئی تو میں نے سوچا اب کوئی بات کرنی چاہیے۔ چنانچہ میں نے پوچھا: ''عزیز صاحب کیسے ہیں؟''

اس نے میرے سوال کا جواب نہ دیا۔ چائے کی پیالی تپائی پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور لفظوں کو جلدی جلدی ادا کر کے کہا: ''منٹو صاحب آپ کسی اچھے ڈاکٹر کو جانتے ہیں؟''

میں نے جواب دیا: ''پونہ میں تو میں کسی کو نہیں جانتا۔''

''اوہ!''

میں نے پوچھا: ''بیمار، ہیں آپ؟''

''جی ہاں:'' وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے دریافت کیا: ''کیا تکلیف ہے؟''

اس کے تیکھے ہونٹ جو مسکراتے وقت سکڑ جاتے تھے یا سکیڑ لیے جاتے تھے وا ہوئے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی اور اٹھ کھڑی ہوئی پھر میرا سگریٹ کا ڈبہ اٹھایا اور ایک سگریٹ سلگا کر کہا: ''معاف کیجیے گا، میں سگریٹ پیا کرتی ہوں۔''

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صرف سگریٹ پیا ہی نہیں کرتی بلکہ پھونکا کرتی تھی۔ بالکل مردوں کی طرح سگریٹ انگلیوں میں دبا کر وہ زور زور سے کش لیتی اور ایک دن میں تقریباً پچھتر سگریٹوں کا دھواں کھینچتی تھی۔

میں نے کہا: ''آپ بتاتی کیوں نہیں کہ آپ کو تکلیف کیا ہے؟''

اس نے کنواری لڑکیوں کی طرح جھنجلا کر اپنا ایک پاؤں فرش پر مارا۔

''ہائے اللہ! میں کیسے بتاؤں آپ کو'' یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ مسکراتے ہوئے تیکھے ہونٹوں کی محراب میں سے مجھے اس کے دانت نظر آئے جو غیر معمولی طور پر صاف اور چمکیلے تھے۔ وہ بیٹھ گئی اور میری آنکھوں میں اپنی ڈگمگاتی آنکھوں کو نہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا: ''بات یہ ہے کہ پندرہ بیس دن اوپر ہو گئے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ۔۔۔۔۔''

پہلے تو میں مطلب نہ سمجھا لیکن جب وہ بولتے بولتے رک گئی تو میں کسی قدر سمجھ گیا ''ایسا اکثر ہوتا ہے؟''

اس نے زور سے کش لیا اور مردوں کی طرح زور سے دھوئیں کو باہر نکالتے ہوئے کہا۔

''نہیں یہاں معاملہ کچھ اور ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کچھ ٹھہر نہ گیا ہو۔''

میں نے کہا: ''اوہ!''

اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اس کی گردن چائے کی طشتری میں دبائی: ''اگر ایسا ہو گیا ہے تو بڑی مصیبت ہو گی۔ ایک دفعہ پشاور میں ایسی دوا لائے تھے جس سے چند دن ہی میں سب صاف ہو گیا تھا۔

میں نے پوچھا: ''آپ کو بچے پسند نہیں؟''

وہ مسکرائی: ''پسند ہیں۔۔۔۔۔ لیکن کون پالتا پھرے۔''

میں نے کہا: ''آپ کو معلوم ہے اس طرح بچے ضائع کرنا جرم ہے۔''

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔۔۔۔۔ پھر اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا: ''مجھ سے عزیز صاحب نے بھی یہی کہا تھا۔ لیکن سعادت صاحب میں پوچھتی ہوں اس میں جرم کی کونسی بات ہے۔ اپنی ہی تو چیز ہے اور ان قانون بنانے والوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ بچہ ضائع کراتے ہوئے تکلیف کتنی ہوتی ہے۔

بڑا جرم ہے!''

میں بے اختیار ہنس پڑا: ''عجیب و غریب عورت ہو تم جانکی!''

جانکی نے بھی ہنسنا شروع کیا: ''عزیز صاحب بھی یہی کہا کرتے ہیں۔''

ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرا مشاہدہ ہے جو آدمی پر خلوص ہوں، ہنستے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو ضرور آ جاتے ہیں۔ اس نے اپنا بیگ کھول کر رومال نکالا اور آنکھیں خشک کر کے بھولے بچوں کے انداز میں پوچھا: ''

سعادت صاحب! بتائیے، کیا میری باتیں دلچسپ ہوتی ہیں؟''

میں نے کہا''بہت۔''

''جھوٹ!''

''اس کا ثبوت؟''

اس نے سگریٹ سلگانا شروع کر دیا:''بھئی، شاید ایسا ہو۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ کچھ کچھ بے وقوف ہوں۔ زیادہ کھاتی ہوں، زیادہ بولتی ہوں، زیادہ ہنستی ہوں۔ اب آپ ہی دیکھئے نا زیادہ کھانے سے میرا پیٹ کتنا بڑھ گیا ہے۔ عزیز صاحب ہمیشہ کہتے رہے جانکی کم کھایا کرو پر میں نے ان کی ایک نہ سنی۔ سعادت صاحب بات یہ ہے کہ میں کم کھاؤں تو ہر وقت ایسا لگتا ہے کہ میں کسی سے کوئی بات کہنا بھول گئی ہوں۔''

اس نے پھر ہنسنا شروع کیا۔ میں بھی اس کے ساتھ شریک ہو گیا۔

اس کی ہنسی بالکل الگ قسم کی تھی۔ بیچ بیچ میں گھنگھرو سے بجتے تھے۔''

''عزیز صاحب کے دن پشاور میں اس کے بغیر کیسے گزرتے ہیں، اس کے متعلق بھی اس کو ہر وقت فکر رہتی تھی۔ پونہ پہنچتے ہی اس نے ایک تار بھیجا تھا۔ اس کے بعد وہ بلا ناغہ ہر روز ایک خط لکھ رہی تھی۔ ہر خط میں یہ تاکید ہوتی تھی کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور دوا باقاعدگی کے ساتھ پیتے رہیں۔

عزیز صاحب کو کیا بیماری تھی، اس کا مجھے علم نہیں لیکن جانکی سے مجھے اتنا معلوم ہوا کہ عزیز صاحب کو چونکہ اس سے محبت ہے، اس لیے وہ فوراً اس کا کہنا مان لیتے ہیں گھر میں کئی بار بیوی سے اس کا جھگڑا ہوا کہ وہ دوا نہیں پیتے لیکن جانکی سے اس معاملے میں انہوں نے کبھی چوں بھی نہ کی۔

شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ جانکی عزیز کے متعلق جو اتنی فکر مند رہتی ہے، محض بکواس ہے بناوٹ ہے، لیکن آہستہ آہستہ میں نے اس کی بے تکلف باتوں سے محسوس کیا کہ اسے حقیقتاً عزیز کا خیال ہے۔ اس کا جب بھی خط آیا، جانکی پڑھ کر ضرور روئی۔''

جانکی کو پونا فلم نگری میں کوئی کام نہ ملا تو منٹو نے اسے بمبئی میں اپنے دوستوں سعید اور نرائن کے پاس بھجوا دیا۔

''سعید اور نرائن کے متعلق جو میرے خیالات تھے میں نے جانکی کے پوچھے بغیر اشارتاً بتا دیئے اور آخر میں اس سے

صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اگر تم اس لائن میں آ گئیں تو کسی نہ کسی مرد کا سہارا تمہیں لینا ہی پڑے گا۔نرائن کے متعلق میرا خیال ہے کہ اچھا دوست ثابت ہوگا۔

میرا مشورہ اس نے سن لیا اور بمبئی چلی گئی۔ دوسرے روز خوش خوش آئی کیونکہ نرائن نے اپنے سٹوڈیو میں ایک سال کے لیے پانچ سو روپے ماہوار پر اسے ملازم کرا دیا تھا۔ یہ ملازمت اسے کیسی ملی، دیر تک اس کے متعلق باتیں ہوئیں۔ جب اور کچھ سننے کو نہ رہا تو میں نے اس سے پوچھا: ''سعید اور نرائن، دونوں سے تمہاری ملاقات ہوئی، ان میں سے کس نے تم کو زیادہ پسند کیا؟''

جانکی کے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔لغزش بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے اس نے کہا: ''سعید صاحب!'' یہ کہہ کر وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ ''سعادت صاحب آپ نے کیوں اتنے پل باندھے تھے۔نرائن کی تعریفوں کے ''؟

میں نے پوچھا: ''کیوں؟''

بڑا ہی واہیات آدمی ہے۔شام کو باہر کرسیاں بچھا کر سعید صاحب اور وہ شراب پینے کے لیے بیٹھے تو باتوں باتوں میں میں نے نرائن بھیا کہا۔ اپنا منہ میرے کان کے پاس لا کر پوچھا: ''تمہاری انگیا کا سائز کیا ہے؟'' بھگوان جانتا ہے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔کیسا لچر آدمی ہے۔'' جانکی کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔''

جانکی کو عزیز کا خیال ستا تا رہا جو اس سے دور پشاور میں تھا۔

''تھوڑی دیر نرائن کو برا بھلا کہنے کے بعد جانکی نے عزیز کے متعلق فکر مند لہجے میں باتیں شروع کر دیں۔کئی دنوں سے اس کا خط نہیں آیا تھا، اس لیے طرح طرح کے خیال اسے ستا رہے تھے۔کہیں انہیں پھر زکام نہ ہو گیا ہو۔اندھا دھند سائیکل چلاتے ہیں، کہیں حادثہ ہی نہ ہو گیا ہو۔ پونہ ہی نہ آ رہے ہوں، کیونکہ جانکی کو رخصت کرتے وقت انہوں نے کہا تھا ایک روز میں چپ چاپ تمہارے پاس چلا آؤں گا۔

باتیں کرنے کے بعد جب اس کا تردد کم ہوا تو اس نے عزیز کی تعریفیں شروع کر دیں۔گھر میں بچوں کا بہت خیال رکھتے ہیں ہر روز صبح ان کو ورزش کراتے ہیں اور نہلا دھلا کر سکول چھوڑنے جاتے ہیں۔ بیوی بالکل پھوہڑ ہے۔اس لیے رشتہ داروں سے سارا رکھ رکھاؤ خود انہی کو کرنا پڑتا ہے۔ایک دفعہ جانکی کو ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا تو بیس دن تک متواتر نرسوں کی

طرح اس کی تیمارداری کرتے رہے، وغیرہ وغیرہ۔''

لیکن بمبئی میں۔۔۔۔۔

''پونہ میں مجھے تقریباً دو مہینے کہانی کا منظر نامہ تیار کرنے میں لگے۔ حق الخدمت وصول کر کے میں بمبئی کا رخ کیا جہاں مجھے ایک نیا کنٹریکٹ مل رہا تھا۔ میں صبح پانچ بجے کے قریب اندھیری پہنچا جہاں ایک معمولی بنگلے میں سعید اور نرائن، دونوں اکٹھے رہتے تھے۔ برآمدے میں داخل ہوا تو دروازہ بند پایا۔ میں نے سوچا سو رہے ہوں گے، تکلیف نہیں دینا چاہیے۔ پچھلی طرف ایک دروازہ ہے۔ جو نوکروں کے لیے اکثر کھلا رہتا ہے، میں اس میں سے اندر داخل ہوا۔ باورچی خانہ اور ساتھ والا کمرہ جس میں کھانا کھایا جاتا ہے، حسب معمول بے حد غلیظ تھے۔ سامنے والا کمرہ مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ میں نے اس کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ کمرے میں دو پلنگ تھے۔ ایک پر سعید اور اس کے ساتھ کوئی اور لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔

مجھے سخت نیند آ رہی تھی دوسرے پلنگ پر میں کپڑے اتارے بغیر لیٹ گیا پائنتی پر کمبل پڑا تھا، یہ میں نے ٹانگوں پر ڈال لیا۔ سونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ سعید کے پیچھے سے ایک چوڑیوں والا ہاتھ نکلا اور پلنگ کے پاس رکھی ہوئی کرسی کی طرف بڑھنے لگا۔ کرسی پر لٹھے کی سفید شلوار لٹک رہی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سعید کے ساتھ جانکی لیٹی تھی۔ میں نے کرسی پر سے شلوار اٹھائی اور اس کی طرف پھینک دی۔''

''تمہیں معلوم نہیں سعید کی کتنی خدمت کر رہی ہے۔ ایسے انسان کی خبرگیری جو پرلے درجے کا بے پروا ہو آسان کام نہیں لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ جانکی اس مشکل کو بڑی آسانی سے نبھا رہی ہے۔ عورت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک پر خلوص اور ایماندار آیا بھی ہے۔ صبح اٹھ کر اس خر ذات کو جگانے میں آدھ گھنٹہ صرف کرتی ہے۔ اس کے دانت صاف کراتی ہے، کپڑے پہناتی ہے، ناشتہ کراتی ہے، اور رات کو جب وہ رم پی کر بستر پر لیٹتا ہے تو سب دروازے بند کر کے اس کے ساتھ لیٹ جاتی ہے۔ اور جب اسٹوڈیو میں کسی سے ملتی ہے تو صرف سعید کی باتیں کرتی ہے۔ سعید صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ سعید صاحب بہت اچھا گاتے ہیں۔ سعید صاحب کا وزن بڑھ گیا ہے۔ سعید صاحب کا پل اوور تیار ہو گیا ہے۔ سعید صاحب کے لیے پشاور سے پوٹھوہاری سینڈل منگوائی ہے۔

سعید صاحب کے سر میں ہلکا ہلکا درد ہے۔ اسپرو لینے جا رہی ہوں۔ سعید صاحب نے آج مجھ پر ایک شعر کہا۔

اور جب مجھ سے مڈبھیڑ ہوتی ہے تو انگیا والی بات یاد کر کے تیوری چڑھا لیتی ہے۔''

میں تقریباً دس دن سعید اور نرائن کا مہمان رہا۔ اس دوران میں سعید نے جانکی کے متعلق مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ ان کا معاملہ کافی پرانا ہو چکا تھا۔ جانکی سے البتہ کافی باتیں ہوئی۔ وہ سعید سے بہت خوش تھی لیکن اسے اس کی بے پروا طبیعت کا بہت گلہ تھا۔ ''سعادت صاحب! اپنی صحت کا بالکل خیال ہی نہیں رکھتے۔ بہت بے پروا ہیں۔ ہر وقت سوچنا، جو ہو اس لیے کسی بات کا خیال ہی نہیں رہتا۔ آپ ہنسنے لگے، لیکن مجھے ہر روز ان سے پوچھنا پڑتا ہے کہ آپ سنڈاس گئے تھے یا نہیں۔''

نرائن نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا، ٹھیک نکلا۔ جانکی ہر وقت سعید کی خبر گیری میں منہمک رہتی تھی۔ میں دس دن اندھیر کے بنگلے میں رہا۔ ان دس دنوں میں جانکی کی بے لوث خدمت نے مجھے بہت متاثر کیا۔ لیکن یہ خیال بار بار آتا رہا کہ عزیز کو کیا ہوا۔ جانکی کو اس کا بھی تو بہت خیال رہتا ہے۔ کیا سعید کو پا کر وہ اس کو بھول چکی ہے۔''

لیکن وہ عزیز کو نہیں بھولی۔

''دو ہی دن گزرے ہوں گے کہ بمبئی سے عزیز کا تار آیا کہ میں آ رہا ہوں۔''

پانچ چھ گھنٹے کے بعد وہ میرے پاس تھا۔ اور دوسرے روز صبح سویرے جانکی میرے کمرے پر دستک دے رہی تھی۔

عزیز اور جانکی جب ایک دوسرے سے ملے تو انہوں نے دیر سے بچھڑے ہوئے عاشق معشوق کی سرگرمی ظاہر نہ کی۔ میرے اور عزیز کے تعلقات شروع سے بہت سنجیدہ اور متین رہے ہیں، شاید اسی وجہ سے وہ دونوں معتدل رہے۔''

''اگر مجھے شدت کی پیاس نہ لگی ہوتی تو عزیز کو تکلیف نہ دیتا، لیکن زیادہ وسکی پینے کے باعث میرا حلق بالکل خشک ہو رہا تھا، اس لیے مجھے دستک دینی پڑی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ جانکی نے آنکھیں ملتے ملتے دروازہ کھولا اور کہا ''سعید صاحب!'' اور جب مجھے دیکھا تو ایک ہلکی سی ''اوہ'' اس کے منہ سے نکل گئی۔

اندر کے پلنگ پر عزیز سو رہا تھا۔ میں بے اختیار مسکرایا۔ جانکی بھی مسکرائی اور اس کے تیکھے ہونٹ ایک کونے کی طرف سکڑ گئے۔ میں نے پانی کی صراحی لی اور چلا آیا۔

صبح اٹھا تو کمرے میں دھواں جمع تھا۔ باورچی خانے میں جا کر دیکھا تو جانکی کاغذ جلا جلا کر عزیز کے غسل کے لیے پانی گرم کر رہی تھی۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور انگیٹھی میں پھونکیں مارتی ہوئی کہنے لگی: ''عزیز

صاحب ٹھنڈے پانی سے نہائیں تو انہیں زکام ہو جاتا ہے۔ میں نہیں تھی پشاور میں تو ایک مہینہ بیمار رہے، اور رہتے بھی کیوں نہیں جب دوا پینی ہی چھوڑ دی تھی۔۔۔۔۔آپ نے دیکھا نہیں کتنے دبلے ہو گئے ہیں۔

وہ سعید اور عزیز کے درمیان پنڈولم بن گئی۔

اور عزیز نہا دھو کر جب کسی کام کی غرض سے باہر گیا تو جانکی نے مجھ سے سعید کے نام تار لکھنے کے لیے کہا: ''مجھے یہاں کل پہنچتے ہی انہیں تار بھیجنا چاہیے تھا۔ کتنی غلطی ہوئی مجھ سے۔ انہیں بہت تشویش ہو رہی ہوگی۔''

اس نے مجھ سے تار کا مضمون بنوایا جس میں اپنی بخریت پہنچنے کی اطلاع تو تھی لیکن سعید کی خیریت دریافت کرنے کا اضطراب زیادہ تھا۔ انجکشن لگوانے کی تاکید بھی تھی۔

چار روز گزر گئے۔ سعید کو جانکی نے پانچ تار روانہ کئے پر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ بمبئی جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اچانک شام کو عزیز کی طبیعت خراب ہو گئی مجھ سے سعید کے نام ایک اور تار لکھوا کر وہ ساری رات عزیز کی تیمارداری میں مصروف رہی۔ معمولی بخار تھا لیکن جانکی کو بے حد تشویش تھی۔ میرا خیال ہے اس تشویش میں سعید کی خاموشی کا پیدا کردہ وہ اضطراب بھی شامل تھا۔ وہ مجھ سے اس دوران میں کئی بار کہہ چکی تھی: ''سعادت صاحب میرا خیال ہے سعید صاحب ضرور بیمار ہیں ورنہ وہ مجھے میرے تاروں اور خطوط کا جواب ضرور لکھتے۔

پانچویں روز شام کو عزیز کی موجودگی میں سعید کا تار آیا جس میں لکھا تھا میں بہت بیمار ہوں فوراً چلی آؤ۔ تار آنے سے پہلے جانکی میری کسی بات پر بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ لیکن جب اس نے سعید کی بیماری کی خبر سنی تو ایک دم خاموش ہو گئی۔ عزیز کو یہ خاموشی بہت ناگوار معلوم ہوئی کیونکہ جب اس نے جانکی کو مخاطب کیا تو اس کے لہجے میں تیزی تھی۔ میں اٹھ کر چلا گیا۔

شام کو جب واپس آیا تو جانکی اور عزیز کچھ اس طرح علیحدہ علیحدہ بیٹھے تھے جیسے ان میں کافی جھگڑا ہو چکا تھا۔ جانکی کے گالوں پر آنسوؤں کا میل تھا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جانکی نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور عزیز سے کہا: ''میں جاتی ہوں، لیکن بہت جلد واپس آ جاؤں گی۔'' پھر مجھ سے مخاطب ہوئی: ''سعادت صاحب ان کا خیال رکھئے، ابھی تک بخار دور نہیں ہوا۔''

میں اسٹیشن تک اس کے ساتھ گیا۔ بلیک مارکیٹ سے ٹکٹ خرید کر اسے گاڑی پر بٹھایا اور گھر چلا آیا۔ عزیز کو ہلکا ہلکا بخار تھا۔ ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے لیکن جانکی کا ذکر نہ آیا۔

تیسرے روز صبح ساڑھے پانچ بجے کے قریب مجھے باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی، اس کے بعد جانکی کی۔ لفظوں کو اوپر تلے کرتی ہوئی وہ عزیز سے پوچھ رہی تھی کہ اس کی طبیعت اب کیسی ہے اور کیا اس کی غیر موجودگی میں اس نے باقاعدہ دوا پی تھی یا نہیں۔ عزیز کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچی لیکن آدھ گھنٹے بعد جب کہ نیند سے میری آنکھیں مندرہی تھیں، عزیز کی خفگی آمیز باتوں کا دبا دبا شور سنائی۔ سمجھ میں تو کچھ نہ آیا لیکن اتنا پتہ چل گیا کہ وہ جانکی سے اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔''

دوسرے روز صبح گیارہ بجے کے قریب جب کہ جانکی کا بخار ایک ڈگری ہلکا تھا اور طبیعت بھی کس قدر درست تھی، بمبئی سے سعید کا تار آیا جس میں بڑے درشت لفظوں میں یہ لکھا تھا ''یاد رہے کہ تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔'' میں بہت منع کرتا رہا لیکن وہ تیز بخار ہی میں پونہ ایکسپریس سے بمبئی روانہ ہوگئی۔

پانچ چھ دنوں کے بعد نرائن کا تار آیا ''ایک ضروری کام ہے، فوراً بمبئی چلی آؤ۔'' میرا خیال تھا کہ کسی پروڈیوسر سے اس نے میرے کنٹریکٹ کی بات کی ہوگی، لیکن بمبئی پہنچ کر معلوم ہوا کہ جانکی کی حالت بہت نازک ہے۔ برونکائٹس بگڑ کر نمونیا میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ جب وہ پونہ سے بمبئی پہنچی تھی تو اندھیری جانے کے لیے چلتی ٹرین میں چڑھنے کی کوشش کرتے گر پڑی تھی جس کے باعث اس کی دونوں رانیں بہت بری طرح چھل گئی تھیں۔

جانکی نے اس جسمانی تکلیف کو بڑی بہادری سے برداشت کیا۔ لیکن جب وہ اندھیری پہنچی اور سعید نے اس کے بندھے ہوئے اسباب کی طرف اشارہ کر کے کہا ''مہربانی کر کے یہاں سے چلی جاؤ'' تو اسے بہت روحانی تکلیف ہوئی ۔نرائن نے مجھے بتایا: ''سعید کے منہ سے یہ برف جیسے ٹھنڈے لفظ سن کر وہ ایک لحظے کے لیے بالکل پتھرا گئی میرا خیال ہے اس نے تھوڑی دیر کے بعد یہ ضرور سوچا ہوگا کہ میں گاڑی کے نیچے آ کر کیوں نہ مرگئی۔ سعادت تم کچھ بھی کہو مگر سعید عورتوں سے جیسا سلوک کرتا ہے بہت ہی نامردانہ ہے۔ بے چاری کو بخار تھا۔ چلتی ریل سے گر پڑی تھی۔ اور وہ بھی اس خرذات کے پاس جلدی پہنچنے کے باعث۔ لیکن اس نے ان باتوں کا خیال ہی نہ کیا اور ایک بار پھر اس سے کہا۔ مہربانی کر کے یہاں سے چلی جاؤ۔۔۔۔۔اس کے لہجے میں منٹو کسی جذبے کا اظہار نہیں تھا۔ بس ایسا تھا جیسے لنوٹائپ مشین سے اخبار کی ایک سطر ڈھل کر باہر نکل آئے۔ مجھے بہت دکھ ہوا، چنانچہ میں وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ شام کو جب واپس آیا تو جانکی موجود نہیں تھی لیکن سعید پلنگ پر بیٹھا رم کا گلاس سامنے رکھے ایک نظم لکھنے میں مصروف تھا۔

میں نے اس سے کوئی بات نہ کی اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دوسرے روز اسٹوڈیو سے معلوم ہوا کہ جانکی ایک

اکسٹرا لڑکی کے گھر خطرناک حالت میں پڑی ہے۔ میں نے اسٹوڈیو کے مالک سے بات کی اور اسے ہسپتال بھجوا دیا۔ کل سے وہیں ہے، بتاؤ اب کیا کیا جائے میں تو اسے دیکھنے جا نہیں سکتا۔ اس لیے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔۔۔۔۔تم جاؤ اور دیکھ کر آؤ کس حالت میں ہے میں ہسپتال گیا تو اس نے سب سے پہلے عزیز اور سعید کے متعلق پوچھا۔ جو سلوک ان دونوں نے اس کے ساتھ کیا تھا، اس کے بعد اس کے پر خلوص استفسار نے مجھے بہت متاثر کیا۔''

جانکی بیمار تھی لیکن نرائن کی تیمارداری سے جانکی پھر سے جی اٹھی اور۔۔۔۔۔

''دس پندرہ دنوں کے بعد کمپنی ہی کے کام سے میں بمبئی آیا۔ کام ختم کر کے جب میں اندھیری پہنچا تو سعید سے معلوم ہوا کہ نرائن ابھی تک ہوٹل ہی میں ہے۔ ہوٹل بہت دور، شہر میں تھا۔ اس لیے رات میں وہیں اندھیری میں رہا۔

صبح آٹھ بجے وہاں پہنچا تو نرائن کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر داخل ہوا تو کمرہ خالی پایا۔ دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا تو ایک دم آنکھوں کے سامنے کچھ ہوا۔ جانکی مجھے دیکھتے ہی لحاف کے اندر گھس گئی۔ اور نرائن نے جو اس کے ساتھ لیٹا تھا، مجھے واپس جاتے دیکھ کر کہا: ''آؤ منٹو آؤ۔۔۔۔۔ میں ہمیشہ دروازہ بند کرنا بھول جاتا ہوں۔۔۔۔۔آؤ یار ۔۔۔۔۔بیٹھو اس کرسی پر، لیکن یہ جانکی کی شلوار دے دینا۔''

جانکی اپنی ذات میں کیسی تھی اس بارے منٹو نے کہا۔

''ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرا مشاہدہ ہے جو آدمی پر خلوص ہوں، ہنستے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو ضرور آ جاتے ہیں۔''

نرائن کے لفظوں سے۔۔۔۔۔!

صبح نو بجے تک ہم بے ہودہ بکواس میں مشغول رہے جس میں بار بار جانکی کا بھی ذکر آیا۔

جب میں نے انگیا والی بات چھیڑی تو نرائن بہت ہنسا۔ ہنستے ہنستے اس نے کہا سب سے مزے دار بات تو یہ ہے کہ جب میں نے اس کے کان کے ساتھ منہ لگا کر پوچھا تمہاری انگیا کا سائز کیا ہے تو اس نے بتا دیا کہا: ''چوبیس''

اس کے بعد اچانک اسے میرے سوال کی بے ہودگی کا احساس ہوا اور مجھے کوسنا شروع کر دیا۔ بالکل بچی ہے۔ جب کبھی مجھ سے مڈبھیڑ ہوتی ہے تو سینے پر دوپٹہ رکھ لیتی ہے۔ لیکن منٹو! بڑی وفادار عورت ہے۔

میں نے پوچھا: ''یہ تم نے کیسے جانا؟''

نرائن مسکرایا: ’’عورت، جو ایک بالکل اجنبی آدمی کو اپنی انگیا کا صحیح سائز بتا دے؛ دھوکے باز ہرگز نہیں ہوسکتی۔‘‘
وہ پرخلوص تھی لیکن شاید اس کے خلوص ہی سے اسے بلیک میل کیا گیا۔



لتیکا رانی

لتیکا رانی۔۔۔! ایک ایسی عورت جو مردوں کی ذہنی حالت سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی قدرتی صلاحیت رکھتی ہے۔ ایسی عورت جو اپنی ذہنی صلاحیت کے باعث مستقبل میں ہونے والے حالات سے واقفیت اس لیے رکھتی ہے کہ وہ سب اس کی اپنی سوچ کا نتیجہ ہوتی ہے۔

’’لتیکا رانی خوب صورت نہیں تھی۔ کوئی ایسی چیز اس کی شکل وصورت میں نہیں تھی جسے پرکشش کہا جا سکے۔ اس کے باوجود جب وہ پہلی بار فلم کے پردے پر آئی تو اس نے لوگوں کے دل موہ لیے اور یہ لوگ جو اسے فلم کے پردے ہی پر ننھی منی اداؤں کے ساتھ بڑے نرم و نازک رومانوں کی چھوٹی سی تتلی کے مانند ادھر سے ادھر تھرکتے دیکھتے تھے، سمجھتے تھے کہ وہ بہت خوب صورت ہے۔ اس کے چہرے مہرے اور اس کے ناز نخرے میں ان کو ایسی کشش نظر آتی تھی کہ وہ گھنٹوں اس کی روشنی میں مبہوت مکھیوں کی طرح بھن بھناتے رہتے تھے۔

اگر کسی سے پوچھا جاتا کہ تمہیں لتیکا رانی کے حسن و جمال میں کون سی سب سے بڑی خصوصیت نظر آتی ہے جو اسے دوسری ایکٹریسوں سے جداگانہ حیثیت بخشتی ہے تو وہ بلا تامل یہ کہتا کہ اس کا بھولپن، اور یہ واقعہ ہے کہ پردے پر وہ انتہا درجے کی بھولی دکھائی دیتی تھی۔ اس کو دیکھ کر اس کے سوا کوئی خیال دماغ میں آ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ بھولی ہے، بہت ہی بھولی اور جن رومانوں کے پس منظر کے ساتھ وہ پیش ہوتی تھی، ان کے تانے بانے سے یوں معلوم ہوتا تھا، کسی جلاہے کی الھڑ لڑکی نے تیار کئے ہیں۔

وہ جب بھی پردے پر پیش ہوئی، ایک معمولی ان پڑھ آدمی کی بیٹی کے روپ میں، چمکیلی دنیا سے دور ایک شکستہ

جھونپڑا ہی جس کی ساری دنیا تھی، کسی کسان کی بیٹی، کسی مزدور کی بیٹی، کسی کانٹا بدلنے والے کی بیٹی اور وہ ان کرداروں کے خول میں یوں سما جاتی تھی جیسے گلاس میں پانی۔

لتیکا رانی کا نام آتے ہی آنکھوں کے سامنے ٹخنوں سے بہت اونچا گھگھرا پہنے کھینچ کر اوپر کی ہوئی ننھی منی چوٹی والی، مختصر قد کی ایک چھوٹی سی لڑکی آ جاتی تھی جو منی کے چھوٹے چھوٹے گھروندے بنانے یا بکری کے معصوم بچے کے ساتھ کھیلنے میں مصروف ہے۔ ننگے پاؤں، ننگے سر، پھنسی پھنسی چولی میں بڑے انکسار کے ساتھ سینے کا چھوٹا سا ابھار، معتدل آنکھیں، شریف سی ناک۔ اس کے سراپا میں یوں سمجھیے کہ دوشیزگی کا خلاصہ ہو گیا تھا جو ہر دیکھنے والے کی سمجھ میں آ جاتا تھا۔

پہلی فلم میں آتے ہی وہ مشہور ہو گئی اور اس کی یہ شہرت اب تک قائم ہے حالانکہ اسے فلمی دنیا چھوڑے ایک مدت ہو چکی ہے۔ اپنی فلمی زندگی کے دوران اس نے شہرت کے ساتھ دولت بھی پیدا کی، اس نپے تلے انداز میں گویا اس کو اپنی جیب میں آنے والی ہر پائی کی آمد کا علم تھا اور شہرت کے تمام زینے بھی اسی انداز میں طے کیے کہ ہر آنے والے زینے کی طرف اس کا قدم بڑے وثوق سے اٹھا ہوتا تھا۔

لتیکا رانی بہت بڑی ایکٹریس اور عجیب و غریب عورت تھی۔ اکیس برس کی عمر میں جب وہ فرانس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ اسکول میں ایک مدراسی نوجوان کو اس سے محبت ہو گئی تھی۔ اس سے شادی کرنے کا وہ پورا پورا فیصلہ کر چکی تھی لیکن جب لندن گئی تو اس کی ملاقات ادھیڑ عمر کے ایک بنگالی سے ہوئی جو وہاں بیرسٹری پاس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لتیکا نے اپنا ارادہ بدل دیا اور دل میں طے کر لیا کہ وہ اس سے شادی کرے گی اور یہ فیصلہ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد کیا تھا۔ اس نے بیرسٹری پاس کرنے والے ادھیڑ عمر کے بنگالی میں وہ آدمی دیکھا جو اس کے خوابوں کی تکمیل میں حصہ لے سکتا تھا۔''

بیرسٹری پاس کرنے والے ادھیڑ عمر بنگالی کا نام پرفلا رائے تھا۔

لتیکا رانی نے خود کو پرفلا رائے کی آنکھ اور سوچ کے ذریعے دیکھا اور پرکھا۔

''پرفلا رائے سے ملنے کے بعد لتیکا نے محسوس کیا تھا کہ وہ جو بظاہر سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہتا ہے اور جس کا دماغ ایسا لگتا ہے، ہمیشہ غائب رہتا ہے، اصل میں سگریٹوں کے پریشان دھوئیں میں اپنے دماغ کی غیر حاضری کے باوجود اس کی شکل و صورت کے تمام اجزاء بکھیر کر ان کو اپنے طور پر سنوارنے میں مشغول رہتا ہے، وہ اس کے انداز تکلم ہونٹوں کی جنبش اور اس کی آنکھوں کی حرکت کو صرف اپنی نہیں، دوسروں کی آنکھوں سے بھی دیکھتا ہے پھر ان کو الٹ پلٹ کرتا ہے اور

اپنے تصور میں تکلم کا نیا انداز، ہونٹوں کی نئی جنبش اور آنکھوں کی نئی حرکت پیدا کرتا ہے۔ایک خفیف سی تبدیلی پر وہ بڑے اہم نتائج کی بنیادیں کھڑی کرتا ہے اور دل ہی دل میں خوش ہوتا ہے۔

لتیکا ذہین تھی۔اس کو فوراً ہی معلوم ہو گیا تھا کہ پرفلا رائے ایسا معمار ہے جو اسے عمارت کا نقشہ بنا کر نہیں دکھائے گا۔ وہ اس سے بھی نہیں کہے گا کہ کون سی اینٹ اکھیڑ کر کہاں لگائی جائے گی تو عمارت کا سقم دور ہو گا۔ چنانچہ اس نے اس خیالات وافکار ہی سے ہدایتیں وصول کرنی شروع کر دی تھیں۔ پرفلا رائے نے بھی فوراً محسوس کر لیا کہ لتیکا اس کے خیالات کا مطالعہ کرتی ہے اور ان پر عمل کرتی ہے۔ وہ بہت خوش ہوا چنانچہ اس خاموش درس وتدریس کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ پرفلا رائے اور لتیکا دونوں مطمئن تھے۔اس لیے وہ دونوں لازم وملزوم سے ہو گئے تھے۔ایک کے بغیر دوسرا نامکمل تھا۔لتیکا کو خاص طور پر اپنی ذہنی وجسمی کروٹ میں پرفلا کی خاموش تنقید کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ وہ اس کی نازوادا کی کسوٹی تھا۔اس کی بظاہر خلا میں دیکھنے والی نگاہوں سے اس کو پتہ چل جاتا تھا کہ اس کی پلک کی کون سی نوک ٹیڑھی ہے لیکن اب وہ حقیقت معلوم کر چکی تھی کہ وہ حرارت جو اس کی خلا میں دیکھنے والی آنکھوں میں ہے، اس کی آغوش میں نہیں ہے۔لتیکا کے لیے یہ بالکل ایسی تھی جیسی کھری چارپائی لیکن وہ مطمئن تھی اس لیے کہ اس کے خوابوں کے بال و پر نکالنے کے لیے پرفلا کی آنکھوں کی حرارت ہی کافی تھی۔

وہ بڑی سیاق داں اور اندازہ گیر عورت تھی۔اس نے دو مہینے کے عرصے ہی میں حساب لگا لیا تھا کہ ایک برس کے اندر اندر اس کے خوابوں کی تکمیل کی ابتداء ہو جائے گی، کیوں ہو گی اور کس فضا میں ہو گی، یہ سوچنا پرفلا رائے کا کام تھا اور لتیکا کو یقین تھا کہ اس کا سدا متحرک دماغ کوئی نہ کوئی راہ پیدا کر لے گا چنانچہ دونوں جب ہندوستان واپس جانے کیا ارادے سے برلن کی سیر کو گئے اور پرفلا کا ایک دوست انہیں اوفا اسٹوڈیوز میں لے گیا تو لتیکا نے پرفلا کی خلا میں دیکھنے والی آنکھوں کی گہرائیوں میں اپنے مستقبل کی صاف جھلک دیکھ لی۔ وہ ایک مشہور جرمن ایکٹریس سے محو گفتگو تھا مگر لتیکا محسوس کر رہی تھی کہ وہ اس کے سراپا کو کینوس کا ٹکڑا بنا کر ایکٹریس لتیکا کے نقش ونگار بنا رہا ہے۔''

جب اس نے یہ سوچ لیا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ اس نے اداکارہ بننا ہے تو اس نے یہ بھی سوچا کہ نمبرون تک پہنچنے کے لیے اسے کیسے لوگوں سے ملنا ہو گا اور ان کے ساتھ تعلق کس طرح نبھانا ہو گا۔

''بمبئی پہنچے تو تاج محل ہوٹل میں پرفلا رائے کی ملاقات ایک انگریز نائٹ سر ہاورڈ پیسکل سے ہوئی جو قریب قریب

قلاش تھا مگر اس کی واقفیت کا دائرہ کار بہت وسیع تھا۔ عمر ساٹھ سے کچھ اوپر، زبان میں لکنت، عادات واطوار شستہ۔ پرفلا رائے اس کے متعلق کوئی رائے قائم نہ کر سکا مگر لتیکا رانی کی اندازہ گیر طبیعت نے فوراً بھانپ لیا کہ اس سے بڑے مفید کام لیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ نرس کی سی توجہ اور خلوص کے ساتھ اس سے ملنے جلنے لگی اور جیسا کہ لتیکا کو معلوم تھا، ایک دن ڈنر پر ایک طرح خود بخود طے ہو گیا کہ اس فلم کمپنی میں جو پرفلا رائے قائم کرے گا، وہ دو مہمان جو سر ہاورڈ پیسکل نے مدعو کیے تھے، ڈائریکٹر ہوں گے اور چند دن کے اندر اندر وہ تمام مراحل طے ہو گئے جو ایک لمٹیڈ کمپنی کی بنیادیں کھڑی کرنے میں درپیش آتے ہیں۔

سر ہاورڈ بہت کام کا آدمی ثابت ہوا۔ یہ پرفلا کا ردعمل تھا لیکن لتیکا شروع ہی سے جانتی تھی کہ وہ ایسا آدمی ہے جس کی افادیت بہت جلد پردہ ظہور پر آ جائے گی۔ وہ جب اس کی خدمت گزاری میں کچھ وقت صرف کرتی تھی تو پرفلا حسد محسوس کرتا تھا۔ مگر لتیکا نے کبھی اس طرف توجہ ہی نہیں دی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی قربت سے بڈھا سر ہاورڈ یک گونہ مسرت محسوس کرتا تھا مگر لتیکا نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی تھی تو پرفلا حسد محسوس کرتا تھا مگر وہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی تھی۔ یوں تو وہ دونوں فائنینسر بھی اصل میں اسی کی وجہ سے اپنا سرمایہ لگانے کے لیے تیار ہوئے تھے اور لتیکا کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کے نزدیک یہ لوگ صرف اسی وقت تک اہم تھے جب تک ان کا سرمایہ ان کی تجوریوں میں تھا۔ وہ ان دنوں کا تصور بڑی آسانی سے کر سکتی تھی جب یہ مارواڑی سیٹھ اسٹوڈیو میں اس کی ہلکی سی جھلک دیکھنے کے لیے بھی ترسا کریں گے۔ لیکن یہ دن قریب لانے کے لیے اس کو کوئی عجلت نہیں تھی۔ ہر چیز اس کے حساب کے مطابق اپنے وقت پر ٹھیک ہو رہی تھی۔"

لتیکا رانی نے جو خواب پرفلا رائے کے ذہن سے دیکھا وہ پورا ہو گیا۔

"پہلی فلم تیار ہو کر مارکیٹ میں آ گئی۔ پرفلا رائے کی خلا میں دیکھنے والی آنکھوں نے جو کچھ دیکھنا چاہا تھا، وہی پردے پر پیش ہوا۔ وہ زمانہ بھڑ کیلے پن کا تھا، ہیروئن وہی سمجھی جاتی تھی جو زرق برق کپڑوں میں ملبوس ہو، اونچی سوسائٹی سے متعلق ہو، ایسے رومانوں میں مبتلا ہو، حقیقت سے جنہیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ایسی زبان بولے جو اسٹیج کے ڈراموں میں بولی جاتی ہے لیکن پرفلا رائے کی پہلی فلم میں سب کچھ اس کا رد تھا۔ فلم بینوں کے لیے یہ تبدیلی، یہ اچانک انقلاب بڑا خوش گوار تھا چنانچہ یہ ہندوستان میں ہر جگہ کامیاب ہوئی اور لتیکا رانی نے عوام کے دل میں فوراً اپنا مقام پیدا کر لیا۔

مگر لتیکا رانی اس قدر کامیابی پر مطمئن نہیں تھی۔ اس نے اپنے ذہن میں جو مستقبل کا پلان ترتیب دیا تھا اس کے مطابق یہ ابتدائی کامیابی تھی۔

''پرفلا رائے اس کامیابی پر بہت مطمئن تھا۔ وہ جب لتیکا کے معصوم حسن اور اس کی بھولی بھالی اداکاری کے متعلق اخباروں میں پڑھتا تھا تو اس کو اس خیال سے کہ وہ ان کا خالق ہے، بہت راحت پہنچتی تھی لیکن لتیکا پر اس کامیابی نے کوئی نمایاں اثر نہیں کیا تھا۔ اس کی اندازہ گیر طبیعت کے لیے یہ کوئی غیر متوقع چیز نہیں تھی۔ وہ کامیابیاں جو مستقبل کی کوکھ میں چھپی ہوئی تھیں، کھلی ہوئی کتاب کے اوراق کی مانند اس کے سامنے تھیں۔''

وہ مستقبل کے بارے میں کس طرح پلان کرتی تھی۔ اس کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے۔

''پہلی فلم کی نمائش عظما پر وہ کیسے کپڑے پہن کر سینما ہال میں جائے گی، اپنے خاوند پرفلا رائے سے دوسروں کے سامنے کس قسم کی گفتگو کرے گی، جب اسے ہار پہنائے جائیں گے تو وہ انہیں اتار کر خوش کرنے کے لیے کس کے گلے میں ڈالے گی، اس کے ہونٹوں کا کون سا کونا کس انداز میں مسکرائے گا، یہ سب اس نے ایک مہینے پہلے سوچ لیا تھا۔ اسٹوڈیو میں لتیکا رانی کی ہر ادا ہر وقت ایک خاص پلان کے تحت عمل میں آتی تھی۔ سر ہاورڈ پیسکل کو پرفلا رائے نے اسٹوڈیو کے بالائی حصے میں جگہ دے رکھی تھی۔ لتیکا صبح سویرے آتی اور کچھ وقت سر ہاورڈ کے ساتھ گزارتی جس کو باغبانی کا شوق تھا۔ نصف گھنٹے تک وہ اس بڈھے الکن نائٹ کے ساتھ پھولوں کے متعلق گفتگو کرتی رہتی، اس کے بعد گھر چلی جاتی اور اپنے خاوند سے اس کی ضروریات کے مطابق تھوڑا سا پیار کرتی، وہ اسٹوڈیو چلا جاتا تو لتیکا اپنے سادہ میک اپ میں مصروف ہو جاتی جس کا ایک ایک خط، ایک ایک نقطہ پرفلا کا بنایا ہوا تھا۔''

لتیکا رانی نے سوچنے کا کام پرفلا رائے پر چھوڑ دیا تھا۔

''وہ جو اس کا معمار تھا، وہ جو لتیکا کا نصف بہتر تھا لیکن پرفلا رائے نے کبھی اس کے متعلق سوچا ہی نہیں تھا، اس کی خلا میں جھانکنے والی آنکھیں ہر وقت سگریٹ کے دھوئیں میں لتیکا کے نئے نئے روپ بنانے میں مصروف رہتی تھی۔''

لتیکا رانی کی ناکامی، اس کے شوہر کے ایک غلط فیصلے کی وجہ سے ظہور میں آنا شروع ہوئی تو اس نے اپنے ذہن کے مطابق اپنا فیصلہ کر لیا۔

''لتیکا اپنے شوہر کے اس فیصلے سے متفق نہیں تھی، لیکن اس نے اسے تبدیل کرانے کی کوشش نہیں کی۔ جو حساب اس نے لگایا تھا، اس کے مطابق تازہ فلم ناکام ثابت ہوئی۔ اس کے بعد دوسری بھی اور جیسا کہ لتیکا کو معلوم تھا، اس کی شہرت دبنے لگی اور ایک دن یہ سننے میں آیا کہ وہ نئے ہیرو کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔
اخباروں میں ایک تہلکا مچ گیا۔ لتیکا کا دامن حیرت ناک طور پر رومان وغیرہ سے پاک رہا تھا۔ لوگوں نے جب سنا کہ وہ نئے ہیرو کے ساتھ بھاگ گئی ہے تو اس کے عشق کی کہانیاں گھڑنی شروع کر دیں۔''

اس نے ایسا کیوں کیا؟

''آخر پرانا ہیرو آگے بڑھا اور اس نے معاملہ سلجھانے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ اس نے لتیکا کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات کئے کہ پر فلا بھونچکا رہ گیا۔ اس نے بتایا۔ ''لتیکا ایسی عورت ہے جو محبت کے لطیف جذبے سے قطعاً محروم ہے، نئے ہیرو کے ساتھ وہ اس لیے نہیں بھاگی کہ اسے اس سے عشق ہے، یہ محض اسٹنٹ ہے۔ ایک ایسی چال جس سے وہ اپنی تنزل پذیر شہرت کو تھوڑے عرصے کے لیے سنبھالا دینا چاہتی ہے۔ اور اس میں اس نے اپنا شریک کار نئے ہیرو کو اس لیے بنایا ہے کہ وہ میری طرح خودسر نہیں۔ وہ اس کو اس طرح اپنے ساتھ لے گئی ہے جس طرح کسی نوکر کو لے جاتے ہیں۔ اگر اس نے مجھے منتخب کیا ہوتا تو اس کی اسکیم کبھی کامیاب نہ ہوتی، میں کبھی اس کے احکام پر نہ چلتا۔ وہ اس وقت واپس آنے کے لیے تیار ہے، کیوں کہ اس کے حساب کے مطابق اس کی واپسی میں بہت دن اوپر ہو گئے ہیں۔ اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید میں یہ باتیں بھی اسی کے مطابق آپ کو بتا رہا ہوں۔''

''پرانا ہیرو اپنے اس مفروضے کے جواز میں یہ کہتا تھا۔ ''لتیکا جیسی عورت عشق و محبت کرنے کی اہلیت رکھتی تو نئے ہیرو کے ساتھ بھاگ کر پھر واپس نہ آتی، یہ اس کا اسٹنٹ تھا اور اس کا پول کھل چکا ہے۔ تم یقین مانو کہ اس کے دن لد چکے ہیں اور وہ اسے جانتی ہے اور اچھی طرح سمجھتی ہے۔ اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ مسٹر رائے کی تمام طاقتیں اسے بنانے اور سنوارنے میں ختم ہو چکی ہیں۔ اب وہ آم کی چسی ہوئی گٹھلی کے مانند ہے، اس میں وہ رس نہیں رہا جس سے وہ اتنی دیر امرت حاصل کرتی رہی تھی۔ تم دیکھ لینا، تھوڑے ہی عرصے بعد اپنی کایا کلپ کرانے کی خاطر وہ کسی اور فلم ساز کی آغوش میں چلی جائے گی۔''

زمانہ اس کے بارے میں باتیں کرتا رہا لیکن وہ اپنے آپ میں مگن رہتی۔

''لتیکا کسی اور فلم ساز کی آغوش میں نہیں گئی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ یہ موڑ اس کے بنائے ہوئے نقشے میں نہیں تھا۔ نئے ہیرو کے ساتھ بھاگ جانے کے بعد اس میں بظاہر کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ سر ہاورڈ پیسکل کے ساتھ صبح سویرے باغبانی میں مصروف وہ اب بھی اسی طرح نظر آتی تھی۔ اسٹوڈیو میں اس کے بارے میں جو باتیں ہوتی تھیں، اس کے علم میں تھیں مگر وہ خاموش رہتی تھی، اسی طرح پر تمکنت طور پر خاموش۔''

''پرفلا رائے ایک بار پھر اپنے خواب ساز دماغ کی منتشر اور مضمحل قوتیں مجتمع کرنا چاہتا ہے اور لتیکا کے وجود کے ڈھیلے تانے بانے میں ایک نئے اور دیرپا خواب کے نقش ونگار ابھارنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ گھر کے نوکروں سے جو خبریں باہر آئی تھیں۔ ان سے پتہ چلتا تھا کہ مسٹر رائے کا مزاج بہت چڑ چڑا ہو گیا ہے، ہر وقت جھنجلایا رہتا ہے، کبھی کبھی غصے میں آ کر لتیکا کو گندی گندی گالیاں بھی دیتا ہے مگر وہ خاموش رہتی ہے، رات کو جب مسٹر رائے کو شب بیداری کی شکایت ہوتی ہے تو وہ اس کا سر سہلاتی ہے، پاؤں دباتی ہے اور سلا دیتی ہے۔ پرانے ہیرو اکو جب ایسی باتیں معلوم ہوتی تھیں تو اسے بہت دکھ ہوتا تھا۔ ''مسٹر رائے بہت بڑا آدمی ہے لیکن افسوس کہ اس نے اپنا اونچا دماغ ایک ایسی عورت کے قدموں میں دال دیا جو کسی طرح بھی اس اعزاز کے قابل نہیں تھی۔ وہ عورت نہیں، چڑیل ہے۔ میرے اختیار میں ہو تو میں اسے گولی سے اڑا دوں۔ سب سے بڑی ٹریجڈی تو یہ ہے کہ مسٹر رائے کو اب اس سے بہت زیادہ محبت ہو گئی ہے۔''

لتیکا رانی خاموش اور اپنے آپ میں مگن شاید اس لیے تھی کہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس کی اپنی سوچ اور اندازے کے مطابق ہو رہا تھا۔ اور پرفلا رائے کی دیوانگی بڑھتی گئی۔ جو لتیکا رانی کی ذات پر شک کرنے کی وجہ سے ہی ہوئی تھی۔

''اچھے سے اچھے ڈاکٹر بلائے گئے مگر پرفلا رائے کی دیوانگی بڑھتی گئی۔ وہ بار بار لتیکا کو اپنے پاس بلاتا تھا مگر جب وہ اس کی نظروں کے سامنے آتی تھی تو اس کا جوش بڑھ جاتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اسے نوچ ڈالے۔ اتنی گالیاں دیتا تھا۔ ایسے ایسے برے ناموں سے اسے یاد کرتا تھا کہ سننے والے حیرت زدہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے تھے۔

پورے چار دن تک پرفلا رائے پر دیوانگی طاری رہی، بہت خطرناک قسم کی دیوانگی۔ پانچویں روز صبح سویرے جب لتیکا سر ہاورڈ پیسکل کے ساتھ باغبانی میں مصروف تھی اور دبی دبی زبان میں اپنے خاوند کی افسوس ناک بیماری کا ذکر کر رہی تھی۔ یہ اطلاع پہنچی کہ مسٹر رائے آخری سانس لے رہے ہیں۔ یہ سن کر لتیکا کو غش آ گیا۔ سر ہاورڈ اسٹوڈیو کے دوسرے آدمی اس کو ہوش میں لانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اچانک دوسری اطلاع پہنچی کہ مسٹر رائے سورگباش ہو گئے۔

دس بجے کے قریب جب لوگ ارتھی اٹھانے کے لیے کوٹھی پر پہنچے تو لتیکا نمودار ہوئی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ بال پریشان تھے۔ وہ سیاہ ساڑھی، سیاہ بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ پرانے ہیرو نے اس کو دیکھا اور بڑی نفرت سے کہا۔
''کم بخت کو معلوم تھا کہ یہ سین کب شوٹ کیا جانے والا ہے۔''



سوگندھی

بمبئی کے نچلے درجے کے علاقے میں رہنے والی تیسرے درجے کی طوائف، جو اپنے وجود میں کئی طرح کے معاشرتی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں میں تضاد رکھتی ہے۔ یہی تضاد اس کے کردار کی اصل بُنت ہیں، جس سے وہ اپنی المیاتی کیفیت کے ساتھ پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اور سوگندھی کے کئی روپ ہمک کر سامنے آجاتے ہیں۔
سوگندھی کوئی اعلیٰ درجے کی نہیں، بلکہ عسرت زدہ ماحول میں زندگی بسر کر رہی تھی۔
''کمرہ بہت چھوٹا تھا۔ جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔ تین چار سوکھے سڑے چپل پلنگ کے نیچے پڑے تھے۔ جن کے اوپر منہ رکھ کر ایک خارش زدہ کتا سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کتے کے بال جگہ جگہ سے خارش کے باعث اڑے ہوئے تھے، دور سے اگر کوئی اس کتے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ پیر پونچھنے والا پرانا ٹاٹ دوہرا کر کے زمین پر رکھا ہے۔
اس طرف چھوٹے سے دیوار گیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی سرخی، ہونٹوں کی سرخ بتی، پاؤڈر کنگھی اور لوہے کی پن جو وہ غالبًا اپنے جوڑے میں لگایا کرتی تھی۔ پاس ہی لمبی کھونٹی کے ساتھ سبز طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا جو گردن کو اپنی پیٹھ کے بالوں میں چھپائے سو رہا تھا۔ پنجرہ کچے امرود کے ٹکڑوں اور گلے ہوئے سنگترے کے چھلکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان بدبودار ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے مچھر یا پتنگے اڑ رہے تھے۔
پلنگ کے پاس ہی بید کی ایک کرسی پڑی تھی۔ جس کی پشت سر ٹیکنے کے باعث بے حد میلی ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے

دائیں ہاتھ کو ایک خوبصورت تپائی تھی ۔ جس پر ہز ماسٹرز وائس کا پورٹ ایبل گراموفون پڑا تھا۔ اس گراموفون پر منڈھے ہوئے کالے کپڑے کی بہت بری حالت تھی ۔ زنگ آلود سوئیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھی ۔ اس تپائی کے عین اوپر دیوارر پر چار فریم لٹک رہے تھے، جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں ۔

ان تصویروں سے ذرا ادھر ہٹ کر، یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف کی دیوار کے کونے میں گنیش جی کی شوخ رنگ تصویر تھی ۔ جو تازہ اور سوکھے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی تھی ۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اتار کر فریم میں جڑوائی گئی تھی ۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیوار گیر پر، جو کہ بے حد چکنا ہو رہا تھا۔ تیل کی ایک پیالی دھری تھی جو دیئے کو روشن کرنے کے لیے وہاں رکھی گئی تھی ۔ پاس ہی دیا پڑا تھا۔ جس کی لو ہوا بند ہونے کے باعث ماتھے کے تلک کے مانند سیدھی کھڑی تھی ۔ اس دیوار گیر پر دھوپ کی چھوٹی بڑی مروڑیاں بھی پڑی تھیں ۔''

سوگندھی کی یہ طوائفانہ زندگی پانچ سال قبل شروع ہوئی تھی اور اس نے اس زندگی کو قبول کر لیا تھا۔

''یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی، آنکھ مچولی ہی تو تھی ۔۔۔۔۔۔ کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی تھی اور کبھی کوئی سے ڈھونڈ لیتا تھا۔۔۔۔۔۔ بس یونہی اس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لیے کہ اس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر روز رات کو کوئی نہ کوئی مرد اس کے چوڑے ساگوانی پلنگ پر ہوتا تھا اور سوگندھی جس کو مردوں کے ٹھیک کرنے کے لیے بے شمار گر یاد تھے۔ اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ ان مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی ۔ ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی ۔ اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی تھی!''

''یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور ان کی راتیں، اس کے جیون کے ہر تار کے ساتھ وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے اس کو خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی جس کی خواہش اس کے دل میں موجود تھی ۔ تاہم وہ چاہتی تھی کہ یونہی اس کے دن بیتتے چلے جائیں، اسے کون سے محل کھڑے کرنا تھے ۔ جو روپے پیسے کا لالچ کرتی ۔ دس روپے اس کا عام نرخ تھا۔ جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلالی کے کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات روپے اسے روز مل جایا کرتے تھے جو اس کی اکیلی جان کے لیے کافی تھے ۔''

''جب وہ بوہنی کرتی تھی تو دور سے گنیش جی کی اس مورتی سے روپے چھوا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر انہیں

اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی۔اس کی چھاتیں چونکہ کافی ابھری ہوئی تھیں،اس لیے وہ جتنے روپے بھی اپنی چولی میں رکھتی، محفوظ پڑے رہتے تھے۔''

''سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ایک بار جمنا نے اس سے کہا تھا۔ نیچے سے ان بمب کے گولوں کو باندھ کے رکھا کر۔انگیا پہنا کرے گی تو ان سختائی ٹھیک رہے گی۔''

وہ جسم جو اس کی دوکان تھی، وہ اس سے بھی غافل ہو چکی تھی۔وہ جسمانی طور پر محض ایک عام سی عورت تھی۔

''وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پلنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوتی تھیں جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔۔۔۔۔۔۔دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا۔جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا۔جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔''

''سوگندھی یہ سن کر ہنس دی۔''جمنا تو سب کو اپنے سر ی کا سمجھتی ہے۔دس روپے میں لوگ تیری بوٹیاں توڑ کر چلے جاتے ہیں۔تو تو سمجھتی ہے کہ سب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا۔۔۔۔۔کوئی موا لگائے تو ایسی ویسی جگہ ہاتھ۔''

''ایک بار آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔۔۔۔۔سوگندھی۔۔۔۔۔تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا!''

وہ عام عورتوں کی طرح خود کو چالاک سمجھتی تھی لیکن وہ ایسی تھی نہیں۔ بلکہ جذباتی تھی جس میں پگھل جانے کا خاصہ پوری طرح موجود تھا۔

''سوگندھی کو واقعی بہت سے گر یاد تھے جو اس نے اپنی ایک دو سہیلیوں کو بتائے بھی تھے۔عام طور پر وہ یہ گر سب کو بتایا کرتی تھی اگر آدمی شریف ہو، زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو تو اس سے خوب شرارتیں کرو۔ان گنت باتیں کرو، اسے چھیڑو ،ستاؤ،اس کے گدی گدی کرو،اس سے کھیلو۔۔۔۔۔اگر داڑھی رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو۔ پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ۔۔۔۔۔اس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے۔۔۔۔۔وہ خوش خوش چلا جائے گا اور تم بھی بچی رہو گی۔ایسے مرد جو گپ چپ رہتے ہوں بڑے خطرناک ہوتے ہیں بہن۔۔۔۔۔ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے!

سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی، جتنی خود کو ظاہر کرتی تھی۔اس کے گاہک بہت کم تھے۔غایت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گر جو اسے یاد تھے اس کے دماغ سے پھسل کر اس کے پیٹ میں آ جاتے تھے۔جس پر ایک بچہ پیدا کرنے کے باعث کئی لکیریں پڑ گئی تھیں۔۔۔۔۔۔ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اسے ایسا لگا تھا کہ اس کے خارش زدہ کتے نے اپنے پنجے سے یہ نشان بنا دیے ہیں۔۔۔۔۔جب جب کوئی کتیا بڑی بے اعتنائی سے اس کے پالتو کتے کے پاس سے گزر جاتی تھی تو وہ شرمندگی دور کرنے کے لیے زمین پر اپنے پنجوں سے اسی قسم کے نشان بنایا کرتا تھا۔

سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی۔لیکن جونہی کوئی نرم ونازک بات۔۔۔۔۔کوئی کوئل بول۔۔۔۔ اس سے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی۔گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا۔مگر اس کے جسم کے باقی اعضا سب کے سب اس کے بہت بری طرح قائل تھے!وہ تھکن چاہتے تھے۔۔۔۔۔ایسی تھکن جو انہیں جھنجھوڑ کر۔۔۔۔۔انہیں مار کر سلانے پر مجبور کر دے!ایسی نیند جو تھک کر چور چور ہونے کے بعد آئے، کتنی مزیدار ہوتی ہے۔۔۔۔۔وہ بے ہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہو جانے پر طاری ہوتی ہے، کتنا آنند دیتی ہے!''

وہ ایک خاص قسم کی کیفیت میں معلق زندگی بسر کر رہی تھی۔

''کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں ہو!اور اس ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا کہ تم ہوا میں بہت اونچی جگہ لٹکی ہوتی ہو۔اوپر ہوا، نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا، بس ہوا ہی ہوا!اور پھر اس میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزا دیتا ہے۔

بچپن میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر اس میں چھپ جایا کرتی تھی، تو ناکافی ہوا میں دم گھٹنے کے ساتھ ساتھ پکڑے جانے کے خوف سے وہ تیز دھڑکن جو اس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتی تھی کتنا مزا دیا کرتی تھی!

سوگندھی چاہتی تھی کہ اپنی ساری زندگی کسی ایسے ہی صندوق میں چھپ کر گزار دے جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں کبھی کبھی اس کو ڈھونڈ نکالیں تا کہ وہ بھی ان کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے۔یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی، آنکھ مچولی ہی تو تھی۔۔۔۔۔''

وہ محبت کرسکتی تھی، اور وہ محبت کے لیے بے تاب بھی تھی۔لیکن۔۔۔۔۔!

''ہر روز رات کو اس کا پرانا یا نیا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا۔''سوگندھی، میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔'' سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ بس موم ہو جاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ پریم۔۔۔۔۔کتنا سندر بول ہے! وہ چاہتی تھی، اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مل لے، اس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے۔۔۔۔۔ یا پھر خود اس کے اندر چلی جائے۔ سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔ کبھی کبھی جب پریم کرنے اور پریم کیے جانے کا جذبہ اس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اسے اپنی گود میں سلا دے!

پریم کر سکنے کی اہلیت اس کے اندر اس قدر زیادہ تھی کہ وہ اس مرد سے جو اس کے پاس آتا تھا وہ محبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ اب تک چاروں مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھی۔ جن کی تصویریں اس کے سامنے دیوار پر لٹک رہی تھی۔ ہر وقت یہ احساس اس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے۔ لیکن یہ اچھا پن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔''

سوگندھی کے لاشعور میں دبی ہوئی یہی خواہش اسے مادھو جیسے خود غرض اور گھٹیا شخص کے قریب لے جاتی ہے۔ وہ مادھو کو سمجھتی بھی ہے لیکن پھر بھی خود فریبی میں مبتلا تھی۔

''البتہ کبھی کبھی جب مادھو نے سے چھٹی لے کر آتا تو اسے اپنے کچھ روپے پلنگ کے پائے کے نیچے اس چھوٹے سے گڑھے میں چھپانا پڑتے تھے جو اس نے خاص اس کام کی غرض سے کھودا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سوگندھی کو رام لال دلال نے بتایا تھا۔ اس نے جب یہ سنا تھا کہ مادھو پونے سے آ کر سوگندھی پر دھاوا بولتا ہے تو کہا تھا۔۔۔۔۔ اس سالے کو تو نے کب سے یار بنایا ہے؟۔۔۔۔۔ یہ بڑی انوکھی عاشقی معشوقی ہے!۔۔۔۔۔ سالا ایک پیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور تیرے ساتھ مزے اڑاتا رہتا ہے۔ مزے الگ رہے تجھ سے کچھ لے بھی مرتا ہے۔۔۔۔۔ سوگندھی! مجھے کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔ اس سالے میں کوئی بات ضرور ہے جو تجھے بھا گیا ہے۔۔۔۔۔ سات سال سے یہ دھندا کر رہا ہوں۔ تم چھوکریوں کی ساری کمزوریاں جانتا ہوں۔''

یہ کہہ کر رام لال دلال نے جو بمبئی شہر کے مختلف حصوں سے دس روپے سے لے کر سو روپے تک والی ایک سو بیس چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا۔ سوگندھی کو بتایا۔۔۔۔۔ ''سالی اپنا دھن یوں نہ برباد کر۔۔۔۔۔ تیرے انگ پر سے یہ کپڑے بھی اتار کر لے جائے گا۔ وہ تیری ماں کا یار!۔۔۔۔۔ اس پلنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں سارے پیسے دبا دیا کر، اور جب وہ یار آیا کرے تو اس سے کہا کر۔۔۔۔۔ ''تیری جان کی قسم مادھو، آج صبح سے ایک دھیلے کا منہ نہیں دیکھا۔ باہر والے سے کہہ کر ایک کوپ چائے اور ایک افلاطون بسکٹ تو منگا، بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔۔۔۔۔ سمجھیں؟ بہت نازک وقت آ گیا ہے میری جان۔۔۔۔۔ اس سالی کانگرس نے شراب بند کر کے بازار بالکل مندا کر دیا ہے پر تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی ہے۔ بھگوان قسم، جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور دارو کی باس سونگھتا ہوں تو جی چاہتا ہے۔ تیری جون میں چلا جاؤں۔''

''دراصل جب مادھو بات کیا کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ سوگندھی ضرور اس میں حصہ لے اور سوگندھی جب کوئی بات کیا کرتی تھی تو یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ مادھو اس میں حصہ لے۔۔۔۔۔ چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی اس لیے وہ کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔''

''مادھو جب پونے سے بقول رام لال دلال، سوگندھی پر دھاوے بولنے کے لیے آتا تھا تو وہ دس پندرہ روپے خراج بھی ادا کرتی تھی! یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اس سے کچھ وہ ہو گیا تھا۔ رام لال دلال ٹھیک کہتا تھا، اس میں ایسی بات ضرور تھی جو سوگندھی کو بہت بھا گئی تھی۔ اب اس کو چھپانا کیا ہے! بتا ہی کیوں نہ دیں!۔۔۔۔۔ سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا تھا۔ ''تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے! جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے؟۔۔۔۔۔ اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟۔۔۔۔۔ چھی چھی چھی۔۔۔۔۔ دس روپے اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلال کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نہ ساڑھے سات؟۔۔۔۔۔ اب ان ساڑھے سات روپوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کو وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا ہوں جو میں لے ہی نہیں سکتا۔۔۔۔۔ مجھے عورت چاہیے پر تجھے کیا اس وقت، اسی گھڑی مرد چاہیے؟۔۔۔۔۔ مجھے تو عورت بھی بھا جائے گی۔ پر کیا میں تجھے جچتا ہوں۔۔۔۔۔ تیرا میرا ناطہ ہی کیا ہے، کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔ بس یہ دس روپے، جن میں سے ڈھائی دلالی میں چلے جائیں گے اور باقی ادھر ادھر بکھر جائیں گے، تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے ہیں۔۔۔۔۔ تو بھی ان کا بجنا سن رہی ہے

اور میں بھی تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور۔۔۔۔۔کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری ۔۔۔۔۔پونے میں حوالدار ہوں۔ مہینے میں ایک بار آیا کروں گا۔ تین چار دن کے لیے ۔۔۔۔۔یہ دھندا چھوڑ۔۔۔۔۔میں تجھے خرچ دیا کروں گا۔۔۔۔۔کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا۔۔۔۔۔؟''

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ جس کا اثر سوگندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لیے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے اس کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں جو سوگندھی نے اپنے سرہانے لٹکا رکھی تھیں، بنا پوچھے گچھے پھاڑ دی تھیں اور کہا تھا۔۔۔۔۔''سوگندھی بھئی میں ایسی تصویریں یہاں نہیں رکھنے دوں گا۔۔۔۔۔اور پانی کا یہ گھڑا۔۔۔۔۔دیکھا، کتنا میلا ہے اور یہ۔۔۔۔۔یہ چیتھڑے۔ یہ چندیاں ۔۔۔۔۔اف کتنی بری باس آتی ہے،۔۔۔۔۔اٹھا کے باہر پھینک ان کو۔۔۔۔۔اور تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔''

تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو دونوں آپس میں گھل مل گئے تھے اور سوگندھی کو تو ایسا محسوس ہوا تھا کہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے۔اس وقت تک کسی نے بھی کمرے میں بدبودار چیتھڑوں، میلے گھڑے اور ننگی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا اور نہ کبھی کسی نے اس کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اس کا ایک گھر ہے۔ جس میں گھریلو پن آ سکتا ہے۔لوگ آتے تھے اور بستر تک کی غلاظت کو محسوس کیے بغیر چلے جاتے تھے، کوئی سوگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا۔''دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے کہیں زکام نہ ہو جائے تجھے۔۔۔۔۔ٹھہر میں تیرے واسطے دوا لاتا ہوں۔'' مادھو کتنا اچھا تھا۔اس کی ہر بات باون تولہ اور پاؤ رتی کی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھیں اس نے سوگندھی کو۔۔۔۔۔اسے محسوس ہونے لگا کہ اسے مادھو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان دونوں سے سمبندھ ہو گیا۔

مہینے میں ایک بار مادھو پونے سے آتا تھا اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا۔''دیکھ سوگندھی! اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو اب تیری میری ٹوٹ جائے گی۔۔۔۔۔اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا۔۔۔۔۔دیکھ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا۔۔۔۔۔ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا۔۔۔۔۔''

نہ مادھو نے کبھی پونہ سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے، کیا ہو رہا

ہے۔ نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے یہ کہا تھا۔ ''تو یہ ٹرٹر کیا کرتا ہے، ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تو نے؟ اور نہ مادھو نے کبھی سوگندھی سے پوچھا تھا۔ ''یہ مال تیرے پاس کہاں سے آیا ہے۔ جب کہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں۔''۔۔۔۔دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک ملمع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے۔۔۔۔لیکن سوگندھی خوش تھی۔ جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ ملمع کیے ہوئے گہنوں ہی پر راضی ہو جایا کرتا ہے۔''

ایسے ہی ماحول میں اس کی زندگی پرسکون ندی کی مانند بسر ہو رہی تھی۔ پھر ایک رات ایسی آئی جس سے اس کے اندر کی عورت بڑی بھیانک صورت میں نمودار ہوگئی۔ اس رات۔۔۔۔۔!

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی۔ ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور، گھر کو واپس گیا تھا۔۔۔۔۔وہ رات کو یہاں بھی ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔''

''وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغہ سے وصول کیے تھے۔ اس کی چشت اور تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور اس کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے!

اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ تو اس برانڈی کے باعث تھی۔ جس کا ادھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اس ''بیوڑا'' کا نتیجہ تھی جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔''

''اس وقت سوگندھی تھکی ماندی سو رہی تھی۔ بجلی کا قمقمہ جسے اُف کرنا وہ بھول گئی تھی۔ اس کے سر کے اوپر لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی۔ مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔۔۔۔۔رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا گیا تو چونک کر اٹھ بیٹھی۔۔۔۔۔وہ ملی جلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور لیسدار تھا۔ دھوتی کے پلو سے اس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جھک کر اس نے پلنگ کے

نیچے دیکھا تو اس کا کتا سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سر دیے سو رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ سوگندھی بستر پر سے اٹھی۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اس نے کلی کی اور دوسرا ڈونگا غٹا غٹ پی کر اس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا۔ ''رام لال؟''

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک گیا تھا۔ بھنا کر کہنے لگا۔ '' تجھے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کلاک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ کہاں مر گئی تھی؟'' ۔۔۔۔۔ پھر آواز دبا کر اس نے ہولے سے کہا۔ ''اندر کوئی ہے تو نہیں؟''

جب سوگندھی نے کہا ''نہیں'' ۔۔۔۔۔ تو رام لال کی آواز پھر اونچی ہو گئی۔ ''تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟'' ۔۔۔۔۔ بھئی حد ہو گئی ہے، کیا نیند پائی ہے۔ یوں ایک ایک چھوکری اتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندا کر چکا ۔۔۔۔۔ اب تو میرا منہ کیا دیکھتی ہے۔ جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار کر وہ پھولوں والی ساڑھی پہن، پوڈر رووڈر لگا اور چل میرے ساتھ ۔۔۔۔۔ باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں ۔۔۔۔۔ چل چل ایک دم جلدی کر۔''

سوگندھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور رام لال آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا۔ ''رام لال آج میرا جی اچھا نہیں۔''

رام لال نے کنگھی دیوار گیر پر رکھ دی اور مڑ کر کہا۔ ''تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔''

سوگندھی نے ماتھے اور کنپٹیوں پر بام ملتے ہوئے رام لال کی غلط فہمی دور کر دی۔ '' وہ بات نہیں رام لال ! ۔۔۔۔۔ ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں ۔۔۔۔۔ بہت پی گئی۔''

رام لال کے منہ میں پانی بھر آیا۔ '' تھوڑی بچی ہو تو لا ۔۔۔۔۔ ذرا ہم بھی منہ کا مزا ٹھیک کر لیں۔''

سوگندھی نے بام کی شیشی تپائی پر رکھ دی اور کہا۔ '' بچائی ہوتی تو یہ موا سر میں درد ہی کیوں ہوتا ۔۔۔۔۔ دیکھ رام لال ! وہ جو باہر موٹر میں بیٹھا ہے اسے اندر ہی لے آؤ۔''

رام لال نے جواب دیا۔ ''نہیں بھئی وہ اندر نہیں آ سکتے۔ ''جنٹلمین آدمی ہیں، وہ تو موٹر کو گلی کے باہر کھڑی کرتے

ہوئے بھی گھبراتے تھے۔۔۔۔۔تو کپڑے وپڑے پہن لےاور ذرا گلی کی نکڑ تک چل۔۔۔۔۔سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

وہ شاید رام لال کے ساتھ نہ جاتی لیکن ایک دوسری عورت کی مجبوری کے لیے وہ تیار ہوگئی۔

''ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔سوگندھی اس حالت میں جبکہ اس کے سر میں شدت کا درد ہورہا تھا۔کبھی قبول نہ کرتی۔مگر اسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔اس کے ساتھ والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی۔جس کا خاوند موٹر کے نیچے آکر مرگیا تھا۔اس عورت کو جوان لڑکی سمیت اپنے وطن جانا تھا۔لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا۔اس لیے وہ کسمپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔سوگندھی نے کل ہی اسکی ڈھارس دی تھی اور اس سے کہا تھا۔''بہن تو چنتا نہ کر۔میرا مرد پونے سے آنے ہی والا ہے۔میں اس سے کچھ روپے لے کر تیرے جانے کا بندوبست کردوں گی۔'' مادھو پونا سے آنے والا تھا مگر روپوں کا بندوبست تو سوگندھی کو ہی کرنا تھا۔چنانچہ وہ اٹھی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگی۔پانچ منٹوں میں اس نے دھوتی اتار کر پھولوں والی ساڑھی پہنی اور گالوں پر سرخ پوڈر لگا کر تیار ہوگئی۔گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک اور ڈونگا پیا اور رام لال کے ساتھ ہولی۔''

پھر وہ واقعہ ہوگیا جس سے اس کی پرسکون ندی جیسی زندگی میں سمندر جیسا مدوجزر پیدا ہوگیا۔

''گلی جو کہ چھوٹے شہروں کے بازار سے بھی کچھ بڑی تھی۔بالکل خاموش تھی۔گیس کے وہ لیمپ جو کھمبوں پر جڑے تھے، پہلے کی نسبت بہت دھندلی روشنی دے رہے تھے۔جنگ کے باعث ان کے شیشوں کو گدلا کردیا گیا تھا۔اس اندھی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر نظر آرہی تھی۔

کمزور روشنی میں اس سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ نظر آنا اور رات کے پچھلے پہر کی بھیدوں بھری خاموشی۔۔۔۔۔سوگندھی کو ایسا لگا کہ اس کے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ایک کسیلا پن اسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا۔جیسے برانڈی اور بیوڑا کی باس سے وہ بھی بوجھل ہورہی ہے۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی تو رام لال نے ایک طرف ہٹ کر کہا۔لیجئے وہ آگئی۔۔۔۔۔بڑی اچھی چھوکری ہے۔تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اسے دھندا شروع کیے'۔۔۔۔۔پھر سوگندھی سے مخاطب ہر کر کہا۔''سوگندھی ادھر آ، سیٹھ جی بلاتے ہیں۔''

سوگندھی ساڑھی کا ایک کنارہ اپنی انگلی پر لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہوگئی۔سیٹھ

صاحب نے بیٹری اسکے چہرے کے پاس روشن کی۔ایک لمحے کے لیے اس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکا چوند پیدا کی۔بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی بجھ گئی۔ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے ''اونہہ'' نکلا۔ پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑ پھڑایا اور کار یہ جا وہ جا۔۔۔۔۔۔

سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چل دی۔اس کی آنکھوں میں ابھی تک بیٹری کی تیز روشنی گھسی ہوئی تھی۔وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر ہوا کیا تھا۔اس ''اونہہ'' کا کیا مطلب تھا۔ جو ابھی تک اس کے کانوں میں بھنبھنا رہی تھی۔کیا؟۔۔۔۔۔کیا؟''

''رام لال دلال کی آواز سنائی دی۔''پسند نہیں کیا تجھے؟۔۔۔۔۔اچھا بھئی میں چلتا ہوں دو گھنٹے مفت ہی میں برباد کیے۔''

یہ سن کر سوگندھی کی ٹانگوں میں، اس کی بانہوں میں، اس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت پیدا ہوئی۔کہاں ہے وہ موٹر۔۔۔۔۔کہاں ہے وہ سیٹھ۔۔۔۔۔تو ''اونہہ'' کا مطلب یہ تھا کہ اس نے مجھے پسند نہیں کیا۔۔۔۔۔اس کی ۔۔۔۔۔''

اس ''اونہہ'' سے اس نے اپنی شدید ترین ہتک محسوس کی تو اسے اپنے بارے سوچنے کا شدت سے احساس ہوا۔وہ خود اپنا موازنہ کرنے بیٹھ گئی۔اور یہی جذباتی کیفیت اس کے اچھے برے خدو خال واضح کرتی ہے۔کئی تصویریں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔

یہ پہلی تصویر اس کی بے بسی کی ہے۔۔۔۔۔!

''گالیاں اس کے پیٹ کے اندر سے اٹھی اور زبان کی نوک پر آ کر رک گئی۔ وہ آخر گالی کسے دیتی۔موٹر تو جا چکی تھی۔اسکی دم کی سرخ بتی اس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ڈوب رہی تھی اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لال لال انگارہ ''اونہہ'' ہے جو اسکے سینے میں برمے کی طرح اترا چلا جا رہا ہے۔اس کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے۔''او سیٹھ۔۔۔۔۔او سیٹھ۔۔۔۔۔ذرا موٹر روکنا اپنی۔۔۔۔۔بس ایک منٹ کے لیے۔'' پر وہ سیٹھ تھڑی ہے اس کی ذات پر بہت دور نکل چکا تھا۔

وہ سنسان بازار میں کھڑی تھی۔ پھولوں والی ساڑھی جو وہ خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتی تھی، رات کے پچھلے پہر

کی ہلکی پھلکی ہوا سے لہرا رہی ہے۔ یہ ساڑھی اور اس کی ریشمیں سرسراہٹ سوگندھی کو کتنی بری معلوم ہوتی وہ چاہتی تھی کہ اس ساڑھی کے چیتھڑے اڑا دے۔ کیونکہ ساڑھی ہوا میں لہرا لہرا کر ''اونہہ، اونہہ'' کر رہی تھی۔

گالوں پر اس نے پوڈر لگایا تھا اور ہونٹوں پر سرخی۔ جب اسے خیال آیا کہ یہ سنگار اس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے کیا تھا تو شرم کے مارے اسے پسینہ آ گیا۔ یہ شرمندگی دور کرنے کے لیے اس نے کیا کچھ نہ سوچا۔۔۔۔۔''میں نے اس موئے کو دکھانے کے لیے تھوڑی اپنے آپ کو سجایا تھا یہ تو میری عادت۔۔۔۔۔میری کیا سب کی یہی عادت ہے۔۔۔۔۔پر۔۔۔۔۔پر۔۔۔۔۔ یہ رات کے دو بجے اور رام لال دلال اور۔۔۔۔۔یہ بازار۔۔۔۔۔اور وہ موٹر اور بیٹری کی چمک''۔۔۔۔۔یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبے اس کی حد نگاہ تک فضا میں ادھر ادھر تیرنے لگے اور موٹر کے انجن کی پھڑ پھڑاہٹ اسے ہوا کے ہر جھونکے میں سنائی دینے لگی۔

اس کے ماتھے پر بام کا لیپ جو سنگار کرنے کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھا۔ پسینہ آنے کے باعث اس کے مساموں میں داخل ہونے لگا اور سوگندھی کو اپنا ماتھا کسی اور کا ماتھا معلوم ہوا جب ہوا کا ایک جھونکا اس کے عرق آلود ماتھے کے پاس سے گزرا تو اسے ایسا لگا کہ سرد سرد ٹین کا ٹکڑا کاٹ کر اس کے ماتھے کیساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ سر میں درد ویسے کا ویسا موجود تھا مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ میں اور ان کے شور نے اس درد کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ سوگندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اوپر لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انگ انگ دکھنے لگے۔ اس کے سر میں درد ہو، اس کی ٹانگوں میں درد ہو، اس کے پیٹ میں درد ہو، اس کی بانہوں میں درد ہو،۔۔۔۔۔ایسا درد کہ وہ صرف درد ہی کا خیال کرے اور سب کچھ بھول جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کے دل میں کچھ ہوا۔۔۔۔۔کیا یہ درد تھا؟۔۔۔۔۔ایک لمحے کے لیے اس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا۔۔۔۔۔یہ کیا تھا؟۔۔۔۔۔لعنت! یہ تو وہی ''اونہہ'' تھی جو اس کے دل کے اندر کبھی سکڑتی اور کبھی پھیلتی تھی۔

گھر کی طرف سوگندھی کے قدم اٹھے ہی تھے کہ رک گئے اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی۔ رام لال دلال کا خیال ہے کہ اسے میری شکل ہی پسند نہیں آئی۔۔۔۔۔شکل کا تو اس نے ذکر نہیں کیا۔ اس نے تو یہ کہا تھا'' سوگندھی تجھے پسند نہیں کیا! اسے۔۔۔۔۔اسے۔۔۔۔۔صرف میری شکل ہی پسند نہیں آئی۔۔۔۔۔نہیں آئی تو کیا ہوا؟۔۔۔۔۔مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی۔۔۔۔۔وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا۔ کتنی بری شکل تھی اس کی۔۔۔۔۔کیا میں نے ناک

بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا تو مجھے گھن نہیں آئی تھی؟۔۔۔۔۔مجھے ابکائی آتے آتے نہیں رک گئی تھی؟۔۔۔۔۔ٹھیک ہے، پر سوگندھی۔۔۔۔۔تو نے اسے دھتکارا نہیں تھا، تو نے اسے ٹھکرایا نہیں تھا۔۔۔۔۔اس موٹر والے سیٹھ نے تو تیرے منہ پر تھوکا ہے۔۔۔اونہہ۔۔۔۔۔اس ''اونہہ'' کا اور مطلب ہی کیا ہے؟۔۔۔۔۔یہی کہ اس چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل۔۔۔۔۔اونہہ۔۔۔۔۔یہ منہ اور مسور کی دال۔۔۔۔۔ارے رام لال تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ کے لے آیا ہے۔۔۔۔۔اس لونڈیا کی اتنی تعریف کر رہا ہے تو۔۔۔۔۔دس روپے اور یہ عورت۔۔۔۔۔خچر کیا بری ہے۔۔۔''

سوگندھی سوچ رہی تھی اور اس کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر سر کی چوٹی تک گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور کبھی رام لال دلال پر جس نے رات کے دو بجے اسے بے آرام کیا۔ لیکن فوراً ہی دونوں کو بے قصور پا کر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھیں، اس کے کان، اس کی بانہیں، اس کی ٹانگیں، اس کا سب کچھ مڑتا تھا کہ اس سیٹھ کو کہیں دیکھ پائے۔۔۔۔۔اس کے اندر یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے ایک بار پھر ہو۔۔۔۔۔صرف ایک بار۔۔۔وہ ہولے ہولے موٹر کی طرف بڑھے، موٹر کے اندر سے ایک ہاتھ بیٹری نکالے اور اس کے چہرے پر روشنی پھینکے۔ ''اونہہ'' کی آواز آئے اور وہ۔۔۔۔۔سوگندھی۔۔۔۔۔اندھا دھند اپنے دونوں پنجوں سے اس کا منہ نوچنا شروع کر دے۔ وحشی بلی کی طرح جھپٹے اور۔۔۔۔۔اور اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو اس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا رکھے تھے اس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے۔۔۔۔۔بالوں سے پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑ مکے مارنا شروع کر دے اور جب تھک جائے۔۔۔۔۔جب تھک جائے تو رونا شروع کر دے۔

رونے کا خیال سوگندھی کو صرف اس لیے آیا کہ اس کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی شدت کے باعث تین چار بڑے بڑے آنسو بن رہے تھے، ایکا ایکی سوگندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا؟ ''تم روتی کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہوا ہے کہ ٹپکنے لگی ہو؟''۔۔۔۔۔آنکھوں سے کیا ہوا سوال چند لمحات تک ان آنسوؤں میں تیرتا رہا جو اب پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ سوگندھی ان آنسوؤں میں سے دیر تک اس خلا کو گھورتی رہی۔ جدھر سیٹھ کی موٹر گئی تھی۔''

''لڑکھڑاتی تو سوگندھی کی نگاہیں یک بیک اس طرف اٹھیں جدھر موٹر گئی تھی مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔۔۔۔۔اسے کتنی زبردست آرزو تھی کہ وہ موٹر پھر ایک بار آئے اور۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔

''نہ آئے۔۔۔۔۔بلا سے۔۔۔۔۔میں اپنی جان کیوں بیکار ہلکان کروں۔۔۔۔۔گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ ان جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے؟ مفت کی درد سری ہی تو ہے۔۔۔۔۔چل سوگندھی گھر چل، ۔۔۔۔۔ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پی، اور تھوڑا سا بام مل کر سوجا۔۔۔۔۔فسٹ کلاس نیند آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔۔سیٹھ اور اس کی موٹر کی ایسی کی تیسی۔۔۔۔۔''

یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کا بوجھ ہلکا ہو گیا جیسے وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا دھو کر باہر نکلی ہے۔ جس طرح پوجا کرنے کے بعد اس کا جسم ہلکا ہو جاتا تھا۔ اسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف چلنے لگی تو خیالات کا بوجھ نہ ہونے کے باعث اس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔''

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آ رہے تھے، اگر اس سیٹھ سے ایک بار۔۔۔۔۔صرف ایک بار ۔۔۔۔۔اس کی مڈبھیڑ ہو جائے تو وہ یہ کرے، نہیں، یہ نہیں یہ کرے۔۔۔۔۔یوں اس سے انتقام لے، نہیں یوں نہیں، یوں ۔۔۔۔۔لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اس کا دوبارہ ملنا محال ہے تو وہ اسے ایک چھوٹی سی گالی دینے ہی پر خود کو راضی کر لیتی۔۔۔۔۔بس صرف ایک چھوٹی سی گالی، جو اس کی ناک پر چیکو مکھی کی طرح بیٹھ جائے اور ہمیشہ وہیں جمی رہے۔''

دوسری تصویر میں وہ خود اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

سوگندھی بدصورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے جوان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا رنگ روپ اب وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پانچ سال پہلے تھا۔ جبکہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ لیکن وہ بدصورت تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس کی شکل وصورت ان عام عورتوں کی سی تھی۔ جن کی طرف مرد گذرتے گذرتے گھور کے دیکھ لیا کرتے ہیں۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں۔ جو سوگندھی کے خیال میں ہر مرد اس عورت میں ضروری سمجھتا ہے۔ جس کے ساتھ اسے ایک دو راتیں بسر کرنا ہوتی ہیں۔ وہ جوان تھی۔ اس کے اعضا متناسب، کبھی کبھی نہاتے وقت جب اس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود ان کی گولائی اور گدراہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران میں شاید ہی کوئی آدمی اس سے ناخوش ہو کر گیا ہو۔۔۔۔۔بڑی ملنسار تھی، بڑی رحم دل تھی۔ پچھلے دنوں کرسمس میں جب وہ گول پیٹھا میں رہا کرتی تھی، ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس آیا تھا۔ صبح اٹھ کر جب اس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھونٹی سے اپنا کوٹ

اتارا تو بٹوہ غائب پایا۔سوگندھی کا نوکر یہ بٹوہ لے اڑا تھا۔ بے چارہ بہت پریشان ہوا۔ چھٹیاں گزارنے کے لیے حیدرآباد سے بمبئی آیا تھا۔اب اس کے پاس واپس جانے کے لیے دام نہ تھے۔سوگندھی نے ترس کھا کر اسے اس کے دس روپے واپس دے دیے تھے۔۔۔۔۔''مجھ میں کیا برائی ہے؟'' سوگندھی نے یہ سوال ہر اس چیز سے کیا جو اس کے سامنے تھی۔گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور سڑک کی اکھڑی ہوئی بجری۔۔۔۔۔ان سب چیزوں کی طرف اس نے باری باری دیکھا، پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں جو اس کے اوپر جھکا ہوا تھا مگر سوگندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔

جواب اس کے اندر موجود تھا ، وہ جانتی تھی کہ وہ بری نہیں اچھی ہے، پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی تائید کرے۔۔۔۔ کوئی ۔۔۔۔کوئی۔۔۔۔ اس وقت کوئی اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے''سوگندھی! کون کہتا ہے،تو بری ہے، جو تجھے برا کہے۔وہ آپ برا ہے۔'' ۔۔۔۔نہیں۔ یہ کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا۔''سوگندھی تو بہت اچھی ہے!''

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کوئی اس کی تعریف کرے۔اس سے پہلے اسے اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے ان پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے۔اس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں ''ماں'' بن رہا تھا۔۔۔۔۔۔وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شے کو اپنی گود میں لینے کے لیے کیوں تیار ہو رہی تھی؟۔۔۔۔اس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے۔۔۔۔اپنے گرم گرم گال اور اس کی ساری سردی چوس لے۔''

تیسری تصویر اس کے اندر کی وہ توڑ پھوڑ ہے۔جس سے وہ بے بسی کے ساتھ اپنا انتقام لیتی نظر آتی ہے۔

''پچاس!'' یہ کہہ کر سوگندھی بڑے آرام سے اٹھی اور ان چار تصویروں کے پاس آہستہ آہستہ گئی جو دیوار پر لٹک رہی تھیں۔بائیں طرف سے تیسرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔بڑے بڑے پھولوں والے پردے کے آگے کرسی پر وہ دونوں رانوں پر اپنے ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا۔پاس ہی تپائی پر دو موٹی موٹی کتابیں دھری تھیں۔تصویر اترواتے وقت تصویر اتروانے کا خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اس کی ہر شے تصویر سے باہر نکل نکل کر گویا پکار رہی تھی۔''ہمارا فوٹو اترے گا۔ہمارا فوٹو اترے گا!'' کیمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا

کہ فوٹو اترواتے وقت اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

سوگندھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔۔۔۔۔اس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی۔ کہ مادھو کے سوئیاں سی چھبیں۔ پلنگ پر سے اٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا۔ کس کی تصویر دیکھ کر تو اس قدر زور سے ہنسی ہے؟''

سوگندھی نے بائیں ہاتھ کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو میونسپلٹی کے داروغہ صفائی کی تھی۔ ''اس کی۔۔۔۔۔منشی پالٹی کے اس داروغہ کی۔۔۔۔۔ذرا دیکھ تو اس کا تھوبڑا۔۔۔۔۔کہتا تھا، ایک رانی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی۔۔۔۔۔اونہہ! یہ منہ اور مسور کی دال۔'' یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اکھڑ آئی!

مادھو کی جرت ابھی دور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ دو منزلوں سے یہ فریم نیچے زمین پر گرا اور کانچ ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی۔ سوگندھی نے اس جھنکار کے ساتھ کہا۔ ''رانی بھنگن کچرا اٹھانے آئے گی تو میرے اس راجہ کو بھی لے جائے گی۔''

ایک بار پھر اسی نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں سے گرنا شروع ہوئی جیسے وہ ان پر چاقو یا چھری کی دھار تیز کر رہی ہے۔ مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا۔ پھر ہنسا۔ ہی ہی ہی۔۔۔۔۔''

سوگندھی نے دوسرا فریم بھی نوچ لیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ ''اس سالے کا یہاں کیا مطلب ہے؟۔۔۔۔۔بھونڈی شکل کا کوئی آدمی یہاں نہیں رہے گا۔۔۔۔۔کیوں مادھو؟''

ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھایا۔ جس میں مادھو کا فوٹو جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ پر سمٹ گیا جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔

زور کا قہقہہ لگا کر اس نے ''اونہہ'' کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کہا۔ ''اچھا کیا؟۔۔۔۔۔اچھا کیا مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔''

آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔۔۔۔۔پر میں پوچھتی ہوں تجھ میں ایسی ہے کون سی چیز جو کسی کو پسند آ سکتی ہے۔۔۔۔۔یہ تیری پکوڑا ایسی ناک،، یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا، یہ تیرے سوجے ہوئے

نتھنے، یہ تیرے بڑے ہوئے کان، یہ تیرے منہ کی باس، یہ تیرے بدن کا میل؟۔۔۔۔۔ تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا، اونہہ۔۔۔۔۔پسند کیوں ہوتا، تیرے عیب جو چھپا رکھے تھے اس نے۔۔۔۔۔آجکل زمانہ ہی ایسا ہے جو عیب چھپائے وہی برا۔۔۔۔۔''

چوتھی تصویر میں وہ ایک خالص طوائف کے روپ میں نظر آتی ہے۔

''سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا۔سوگندھی کے بچے تو آیا کس لیے ہے یہاں؟۔۔۔۔۔تیری ماں رہتی ہے اس جگہ جو تجھے روپے دے گی؟ یا تو کوئی ایسا بڑا گبھرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہوگئی ہوں۔۔۔۔ کتے، کمینے، مجھ پر رعب گانٹھتا ہے؟ میں تیری دبیل ہوں کیا؟۔۔۔۔۔ بھک منگے تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے؟۔۔۔۔۔ میں پوچھتی ہوں تو ہے کون؟۔۔۔۔۔ چور یا گٹھ کترا؟۔۔۔۔۔اس وقت تو میرے مکان میں کرنے کیا آیا ہے؟۔۔۔۔۔بلاؤں پولیس کو؟۔۔۔۔۔پونے میں تجھ پر کیس ہو نہ ہو، یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کردوں۔۔۔۔۔''

مادھو سہم گیا۔دبے ہوئے لہجے میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا۔''سوگندھی۔تجھے کیا ہوگیا ہے؟''

تیری ماں کا سر۔۔۔۔۔تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا۔۔۔۔۔ بھاگ یہاں سے، ورنہ ۔۔۔۔۔''سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کتا جو سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا، ہڑ بڑا کر اٹھا اور مادھو کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔کتے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی اور زور سے ہنسنے لگی۔''

اور پانچویں تصویر عورت کی اس المیاتی کیفیت کا اظہار ہے، جو یقیناً بہت بھیانک ہے۔

''اس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔سیڑھیاں اتار کر جب کتا اپنی ٹنڈ منڈ دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑ پھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی۔۔۔۔۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا۔۔۔۔۔ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے۔۔۔۔۔جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے۔۔۔۔۔ یہ خلاء جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہوگیا تھا۔اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔اس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ادھر دماغ کو پر کرتی تھی۔ادھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لیٹا کر سو گئی!''



موذیل

موذیل۔۔۔۔۔!ایک ایسی یہودی لڑکی، جو الہڑ، منہ پھٹ اور لا پرواہ تھی۔اس کے خدوخال اس سکھ نوجوان کے توسط سے سامنے آتے ہیں، جو انتہائی مذہبی ہے اور اس کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا۔

موذیل دیکھنے میں کیسی تھی۔۔۔۔۔!

''جس دن اس نے ایڈوانی چیمبرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دورے مالے پر فلیٹ لیا، اسی دن اس کی مڈبھیڑ موذیل سے ہو گئی۔جو پہلی نظر دیکھنے پر اسے خوفناک طور پر دیوانی معلوم ہوئی تھی۔کٹے ہوئے بھورے بال اس کے سر پر پریشان تھے۔، بیحد پریشان ہونٹوں پر لپ اسٹک یوں جمی تھی جیسے گاڑھا خون اور وہ بھی جگہ جگہ سے چٹخی ہوئی تھی۔ڈھیلا ڈھالا لمبا سفید چغہ پہنے تھی۔جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیل پڑی بڑی بڑی چھاتیاں چوتھائی کے قریب نظر آرہی تھیں۔بانہیں جو کہ ننگی تھیں مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی کسی سیلون سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی ننھی ننھی ہوائیاں ان پر جم گئی ہیں۔

ہونٹ اتنے موٹے نہیں تھے۔مگر گہرے عنابی رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس انداز سے لگائی گئی تھی کہ وہ موٹے اور بھینسے کے گوشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔''

وہ انتہائی لا پرواہ تھی یا سوشل؟ ترلوچن اس کا فیصلہ نہ کر سکا۔

''وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی بے اعتنائی اور بے التفاتی برتتی تھی۔اس کے کہنے پر فوراً سج بن کر سینما جانے پر تیار ہو جاتی تھی مگر جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو ادھر ادھر نگاہیں دوڑانا شروع کر دیتی۔کوئی اس کا شناسا نکل آتا تو زور سے ہاتھ ہلاتی اور ترلوچن سے اجازت لیے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھتی۔

ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ترلوچن نے خاص طور پر موذیل کے لیے پر تکلف کھانے منگوائے ہیں۔مگر اس کو کوئی اپنا پرانا دوست نظر آ گیا ہے اور وہ نوالہ چھوڑ کر اس کے پاس جا بیٹھی ہے اور ترلوچن کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔

ترلوچن بعض اوقات بھنا جاتا تھا، کیونکہ وہ اسے قطعی طور پر چھوڑ کر اپنے ان پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔کبھی سر درد کا بہانہ،کبھی پیٹ کی خرابی کا جس کے متعلق ترلوچن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ فولاد کی طرح سخت ہے اور کبھی خراب نہیں ہوسکتا۔''

موذیل نے ترلوچن سے دوستی بھی کی۔لیکن اسے ترلوچن کی داڑھی اور مونچھوں پر اعتراض تھا۔

''ترلوچن کا خیال تھا کہ موذیل سے دوستی پیدا کرنا شاید مشکل ہو۔لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے گھل مل گئی۔لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خود سر تھی۔وہ ترلوچن کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔اس سے کھاتی تھی۔اس سے پیتی تھی۔اس کے ساتھ سینما جاتی تھی۔سارا سارا دن اس کے ساتھ جوہو پر نہاتی تھی۔لیکن جب وہ بانہوں اور ہونٹوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔کچھ اس طور پر سے گھرکتی کہ اس کے سارے ولولے اس کی داڑھی اور مونچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے۔''

''دو برس تک وہ اسی طرح خوار ہوتا رہا۔لیکن ثابت قدم رہا۔آخر ایک روز جب کہ موذیل موج میں تھی۔اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا۔''موذیل۔۔۔۔۔۔کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو۔''

موذیل اس کے بازوؤں سے جدا ہوگئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فراک کا گھیرا دیکھنے لگی۔پھر اس نے اپنی موٹی موٹی یہودی آنکھیں اٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا۔''میں سکھ سے محبت نہیں کرسکتی۔''

ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دہکتی ہوئی چنگاریاں رکھ دی ہیں۔اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔۔۔۔۔۔''موذیل! تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہو۔۔۔۔۔۔یہ میرا مذاق نہیں، میری محبت کا مذاق ہے۔''

موذیل اٹھی اور اس نے اپنے بھورے ترشے ہوئے بالوں کو ایک دلفریب جھٹکا دیا۔''تم شیو کرالو اور اپنے سر کے بال کھلے چھوڑ دو۔۔۔۔۔۔تو میں شرط لگاتی ہوں کئی لونڈے تمہیں آنکھ ماریں گے۔۔۔۔۔۔تم خوبصورت ہو۔''

ترلوچن کے کیسوں میں مزید چنگاریاں پڑ گئیں۔اس نے آگے بڑھ کر زور سے موذیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس

کے عنابی ہونٹوں میں اپنے مونچھوں بھرے ہونٹ پیوست کر دیئے۔

موذیل نے ایک دم ''پھوں پھوں'' کی اور اس کی گرفت سے علیحدہ ہوگئی۔ ''میں صبح اپنے دانتوں پر برش کر چکی ہوں تم تکلیف نہ کرو۔''

ترلوچن چلایا۔ ''موذیل۔''

موذیل وینٹی بیگ سے ننھا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی جس پر لگی ہوئی گاڑھی لپ اسٹک پر خراشیں آ گئی تھیں۔ ''خدا کی قسم ۔۔۔۔۔۔ تم اپنی داڑھی اور مونچھوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے ۔۔۔۔۔۔ ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میرا نیوی بلو سکرٹ بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں۔ ۔۔۔۔۔۔ بس تھوڑا سا پٹرول لگانے کی ضرورت ہوگی۔''

''ترلوچن غصے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ موذیل بھی آ گئی اور اس نے ترلوچن کی داڑھی کھولنی شروع کر دی ۔۔۔۔۔۔ اس میں جو پنیں لگی تھیں۔ وہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے دانتوں تلے دبا لیں۔

ترلوچن خوبصورت تھا۔ جب اس کے داڑھی مونچھ نہیں اگی تھی تو واقعی لوگ اس کے کھلے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر دھوکا کھا جاتے تھے کہ وہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے، مگر بالوں کے اس انبار نے اب اس کے تمام خدوخال جھاڑیوں کے مانند اندر چھپا لیے تھے۔ اس کو اس کا احساس تھا۔ مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرماں بردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کر دے، جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔

جب داڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موذیل سے پوچھا۔ ''یہ تم کیا کر رہی ہو؟''

دانتوں میں پنیں دبائے وہ مسکرائی۔ ''تمہارے بال بہت ملائم ہیں ۔۔۔۔۔۔ میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میری نیوی بلو سکرٹ صاف ہو سکے گا ۔۔۔۔۔۔ ترلوچ ۔۔۔۔۔۔ تم یہ مجھے دے دو۔ میں انہیں گوندھ کر اپنے لیے ایک فسٹ کلاس بٹوا بناؤں گی۔''

اب ترلوچن کی ڈاڑھی میں چنگاریں بھڑ کنے لگیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے موذیل سے مخاطب ہوا۔ ''میں نے آج تک تمہارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا تم کیوں اڑاتی ہو ۔۔۔۔۔ دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا ۔۔۔۔۔ میں یہ کبھی برداشت نہ کرتا۔ مگر صرف اس لیے کرتا رہا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے ۔۔۔۔۔ کیا تمہیں اس

کا پتہ نہیں؟''

موذیل نے ترلوچن کی داڑھی سے کھیلنا بند کر دیا۔''مجھے معلوم ہے۔''

''پھر۔''ترلوچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تہ کئے اور موذیل کے دانتوں سے پنیں نکال لیں۔''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بکواس نہیں۔۔۔۔۔میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے۔''بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اٹھی اور دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔میں بھی قریب قریب یہی فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی۔''

ترلوچن اچھل پڑا۔''سچ؟''

موذیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید مضبوط دانت ایک لحظے کے لیے چمکے۔''ہاں۔''

ترلوچن نے اپنی نصف لپٹی ہوئی داڑھی ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا''تو۔۔۔۔۔تو کب؟''

موذیل الگ ہٹ گئی۔''جب۔۔۔۔۔تم اپنے یہ بال کٹوا دو گے؟''

موذیل فرش پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی۔''تم بکواس کرتے ہو ترلوچ۔۔۔۔۔تم میں اتنی ہمت نہیں ہے۔''

اس نے ترلوچن کے دل و دماغ سے مذہب کے رہے سہے خیال کو نکال باہر پھینکا۔''تم دیکھ لو گی۔''

''دیکھ لوں گی۔''اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ترلوچن کی مونچھوں کو چوما اور''پھوں پھوں''کرتی باہر نکل گئی۔''

''بال کٹوا کر وہ پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز چٹ موذیل کو بھیجی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے،تھوڑی دیر کے لیے آجائے۔موذیل آئی۔ترلوچن کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لحظے کے لیے ٹھٹکی۔پھر''مائی ڈارلنگ ترلوچن''کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اس کا سارا چہرہ عنابی کر دیا۔

اس نے ترلوچن کے صاف اور ملائم گالوں پر ہاتھ پھیرا۔اس کے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا۔۔۔۔۔موذیل نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی سکرٹ کا گھیرا اٹھایا اور اسے پونچھنا شروع کر دیا۔۔۔۔۔ترلوچن شرما گیا۔اس نے سکرٹ نیچی کی اور سرزنش کے طور پر اس سے کہا۔''نیچے کچھ پہن تو لیا کرو۔''

موذیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صرف اتنا ہی کہا۔ '' مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ایسے ہی چلتا ہے۔''

ترلوچن کو وہ پہلا دن یاد آ گیا۔ جب وہ اور موذیل دونوں ٹکرا گئے تھے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڈ مڈ ہو گئے تھے۔ مسکرا کر اس نے موذیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ '' شادی کل ہو گی!''

'' ضرور۔'' موذیل نے ترلوچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

موذیل کو ترلوچن سے محبت نہیں تھی۔ اس لیے شادی کے طے ہو جانے کے باوجود وہ بجائے اس کے ساتھ جانے کے کسی اور دوست کے ساتھ دیولالی چلی گئی۔ وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ ترلوچن نے اس کے بارے میں کئی طرح سے سوچا۔

'' تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس یا کہ موذیل بہت واہیات لڑکی تھی۔ جس کے دل کے ساتھ پتھر لگے ہوئے ہیں اور جو چڑوں کے مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پھدکتا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو یک گونہ تسکین ہوئی تھی کہ وہ موذیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا تھا۔

لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی موذیل کی یاد ایک چٹکی کے مانند اس کے دل کو پکڑ لیتی تھی اور پھر چھوڑ کر کدکڑے لگاتی غائب ہو جاتی تھی۔ وہ بے حیا تھی۔۔۔۔۔ بے مروت تھی، اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند تھی۔ اس لیے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ دیولالی میں اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے، جس نے نئی نئی کار خریدی تھی یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کو اس خیال سے سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہو گی۔ حالانکہ اس کو موذیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔''

موذیل صرف اپنی مرضی کرنا جانتی تھی۔ اسے جو پسند ہوتا وہی لینا چاہتی۔

'' وہ اس پر سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا۔ لیکن اپنی مرضی سے۔ ورنہ موذیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے، مگر اسی دکان میں موذیل جھوٹے اور بھڑکیلے اور بہت سستے آویزوں پر مر مٹی اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر ترلوچن سے منتیں کرنے لگی کہ وہ انہیں خرید دے۔''

موذیل کو شاید مذہب سے نہیں بلکہ مذہبی علامات پسند نہیں تھی۔

’’ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا کہ موذیل کس قماش کی لڑکی ہے۔ کس آب وگل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لیٹی رہتی تھی۔ اس کو چومنے کی اجازت دیتی تھی۔ وہ سارا کا سارا صابن کی مانند اس کے جسم پر پھر جاتا تھا مگر وہ اس کو اس سے آگے ایک انچ بڑھنے نہیں دیتی تھی۔ اس کو چڑانے کی خاطر اتنا کہہ دیتی تھی۔ ’’تم سکھ ہو۔۔۔۔۔۔ مجھے تم سے نفرت ہے!‘‘۔۔۔۔۔

ترلوچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موذیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں رتی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس تک اس کی صحبت میں نہ گذارتی۔ دوٹک فیصلہ کر دیتی۔ انڈرویئر اس کو ناپسند تھے۔ اس لیے کہ ان سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ ترلوچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم وحیا کا واسطہ دیا، مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ پہنی۔

ترلوچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا تو وہ چڑ جاتی تھی۔ ’’یہ حیاویا کیا بکواس ہے۔۔۔۔۔ اگر تمہیں اس کا کچھ خیال ہے تو آنکھیں بند کرلیا کرو۔۔۔۔۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ کونسا لباس ہے جس میں آدمی ننگا نہیں ہوسکتا۔۔۔۔۔ یا جس میں سے تمہاری نگاہیں پار نہیں ہوسکتیں۔۔۔۔۔ مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو۔۔۔۔۔ تم سکھ ہو۔۔۔۔۔ مجھے معلوم ہے کہ تم پتلون کے نیچے ایک سلی سا انڈرویئر پہنتے ہو جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔۔۔۔۔ یہ بھی تمہاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح تمہارے مذہب میں شامل ہے۔۔۔۔۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمہارا مذہب انڈرویئر میں چھپا بیٹھا ہے۔‘‘

ترلوچن کو شروع شروع میں ایسی باتیں سن کر غصہ آیا تھا۔ مگر بعد میں غور وفکر کرنے پر وہ کبھی کبھی لڑھک جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ موذیل کی باتیں شاید نادرست نہیں اور جب اس نے اپنے گیسوں اور داڑھی کا صفایا کرا دیا تھا تو اسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہوا کہ وہ بیکار اتنے دن بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھرا جس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔‘‘

موذیل جب اسے دوبارہ ملی تو اس کا زاویہ نگاہ بدل چکا تھا۔ اس لیے اسے وہ کچھ دوسری طرح سے نظر آئی کیونکہ اس وقت وہ ایک خاصی ذہنی کیفیت اور الجھی ہوئی کشمکش میں مبتلا تھا۔

’’پانی کی ٹینکی کے پاس پہنچ کر ترلوچن رک گیا۔ موذیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کر دیا۔۔۔۔۔ کرپال کور۔ ایک پاکیزہ لڑکی۔ جس سے اس کو محبت ہوئی تھی۔ خطرے میں تھی، وہ ایسے محلے میں تھی جس

میں کٹر قسم کے مسلمان رہتے تھے اور وہاں دو تین واردات بھی ہو چکی تھیں۔۔۔۔۔لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس محلے میں اڑتالیس گھنٹے کا کرفیو تھا۔مگر کرفیو کی کون پروا کرتا ہے۔اس چالی کے مسلمان اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کرپال کور، اس کی ماں اور اس کے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفایا کر سکتے تھے۔''

موذیل کے ذہن میں مذہب پھر بھی اٹکا رہا۔

''بلڈنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں جو سب کی سب گھر میں کھڑاؤں پہنتی تھیں۔۔۔۔۔آواز قریب آتی گئی۔ یک لخت اس نے دوسری ٹینکی کے پاس موذیل کو دیکھا، جو یہودیوں کی خاص قطع کا ڈھیلا ڈھالا کرتہ پہنے بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی۔۔۔۔۔اس زور کی کہ ترلوچن کو محسوس ہوا اس کے آس پاس کی ہوا چیخ جائے گی۔

ترلوچن۔پانی کے نل پر سے اٹھا۔اس نے سوچا۔''یہ ایکا ایکی کہاں سے نمودار ہو گئی۔۔۔۔۔اور اس وقت ٹیرس پر کیا کرنے آئی ہے؟''

موذیل نے ایک اور انگڑائی لی۔۔۔۔۔اب ترلوچن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔

ڈھیلے ڈھالے کرتے میں اس کی مضبوط چھاتیں دھڑکیں۔۔۔۔۔ترلوچن کی آنکھوں کے سامنے کئی گول گول اور چپٹے چپٹے نیل ابھر آئے۔وہ زور سے کھانسا۔موذیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔اس کا ردعمل بالکل خفیف تھا۔کھڑاؤں گھسیٹتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی ننھی منی داڑھی دیکھنے لگی۔''تم پھر سکھ بن گئے ترلوچ؟''

داڑھی کے بال ترلوچن کو چبھنے لگے۔

موذیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت رگڑی اور مسکرا کر کہا۔''اب یہ برش اس قابل ہے کہ میری نیو بلو سکرٹ صاف کر سکے۔۔۔۔۔مگر وہ تو وہیں دیولالی میں رہ گئی ہے۔''

ترلوچن خاموش رہا۔

موذیل نے اس کے بازو کی چٹکی لی۔''بولتے کیوں نہیں سردار صاحب؟''

ترلوچن اپنی پچھلی بے وقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔تاہم اس نے صبح کے ملگجے اندھیرے میں موذیل کے چہرے کو غور سے دیکھا۔۔۔۔۔کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ایک طرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ترلوچن نے اس سے پوچھا۔بیمار رہی ہو؟''

''نہیں۔'' موذیل نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

''پہلے سے کمزور دکھائی دیتی ہو؟''

''میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں۔'' موذیل پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گئی اور کھڑاؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی۔ ''تم گویا کہ۔۔۔۔اب پھر۔۔۔۔۔۔نئے سرے سے سکھ بن رہے ہو۔''

ترلوچن نے کسی قدر ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔ ''ہاں!''

موذیل کے ہونٹوں پر لپ اسٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گاؤں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری سے موٹی رگ کے گوشت کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

مسکرانے کے بعد وہ ہنسی۔ ''تم اب یہ داڑھی منڈا ڈالو تو کسی کی بھی قسم لے لو، میں تم سے شادی کر لوں گی۔''

ترلوچن کے جی میں آئی کہ اس سے کہے کہ وہ ایک بڑی شریف، باعصمت اور پاک طینت کنواری لڑکی سے محبت کر رہا ہے اور اسی سے شادی کرے گا۔۔۔۔موذیل اسکے مقابلے میں ایک فاحشہ ہے، بدصورت ہے، بے وقوف ہے، بے مروت ہے مگر وہ اس قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا۔ اس نے موذیل سے صرف اتنا کہا۔ ''موذیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میرے گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی ہے۔۔۔۔جو مذہب کی پابند ہے۔ اسی کے لیے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

موذیل کے ذہن میں مذہب پھر بھی اٹکا رہا۔

موذیل سوچ بچار کی عادی نہیں تھی، لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑاؤں پر نصف دائرے میں گھوم کر ترلوچن سے کہا۔ ''وہ مذہب کی پابند ہے تو تمہیں کیسے قبول کرے گی؟۔۔۔۔کیا اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دفعہ اپنے بال کٹوا چکے ہو؟''

ترلوچن کے خیال میں وہ جیسی بھی عورت تھی۔ لیکن جب اس نے اپنی ذہنی کیفیت اور الجھی ہوئی کشمکش کے بارے میں اسے بتایا تو وہ بالکل ایک نئی موذیل سے ملا۔

ترلوچن کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ موذیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کو سارا ماجرا سنا دیا۔
موذیل ہنسی۔ ''تم اول درجے کے ایڈیٹ ہو۔۔۔۔جاؤ اس کو لے آؤ۔ ایسی کیا مشکل ہے؟''
''مشکل!۔۔۔۔موذیل، تم اس معاملے کی نزاکت کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں۔۔۔۔کسی بھی معاملے کی نزاکت

۔۔۔۔۔تم ایک لاابالی قسم کی لڑکی ہو۔۔۔۔۔یہی وجہ ہے کہ تمہارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے، جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا۔''

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں پانی کے نل کے ساتھ ماری۔''افسوس بی ڈیمڈ۔۔۔۔۔سلی ایڈیٹ۔۔۔۔۔تم یہ سوچو کہ تمہاری اس۔۔۔۔۔کیا نام ہے اس کا۔۔۔۔۔اس حملے سے بچا کر لانا کیسے ہے۔۔۔۔۔تم بیٹھ گئے ہو تعلقات کا رونا رونے۔۔۔۔۔تمہارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے۔۔۔۔۔تم ایک سلی قسم کے آدمی ہو۔۔۔۔۔اور بہت ڈرپوک، مجھے نڈر مرد چاہیے۔۔۔۔۔لیکن چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔۔۔چلو آؤ، تمہاری اس کور کر لے آئیں!''

اس نے ترلوچن کا بازو پکڑ لیا۔۔۔۔۔ترلوچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا۔''کہاں سے؟''

''وہیں سے جہاں وہ ہے۔۔۔۔۔میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں۔۔۔۔۔چلو آؤ میرے ساتھ۔''

''مگر سنو تو۔۔۔۔۔کرفیو ہے۔''

''موذیل کے لیے نہیں۔۔۔۔۔چلو آؤ۔''

موذیل خطرے میں بھی کودنے پر تیار ہوگئی۔ شاید اس کے نزدیک ایک انسانی جان کی زیادہ اہمیت تھی۔ اسی خوف ناک فضا میں اس کے کردار کے بہت سارے پہلو عیاں ہوتے چلے گئے۔

وہ نڈر تھی۔

''ترلوچن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔''موذیل، وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے۔۔۔۔۔اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔

موذیل چڑھ گئی۔''اوہ، تمہاری محبت بی ڈیمڈ۔۔۔۔۔میں پوچھتی ہوں۔ کیا سارے سکھ تمہاری طرح کے بیوقوف ہوتے ہیں۔۔۔۔۔اس کی جان کا خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے۔۔۔۔۔اور شاید وہ اپنا انڈرویئر بھی جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔''

ترلوچن نے کہا۔''وہ تو میں ہر وقت پہنے ہوتا ہوں۔''

''بہت اچھا کرتے۔۔۔۔۔مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس محلے کا ہے جہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی۔۔۔۔۔تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کر دیئے جاؤ گے۔''

ترلوچن نے مختصر سا جواب دیا۔ ''مجھے اس کی پروا نہیں۔۔۔۔۔اگر میں تمہارے ساتھ وہاں جاؤں تو پگڑی پہن کر جاؤں گا۔۔۔۔۔میں اپنی محبت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا!''

موذیل جھنجھلا گئی۔ اس زور سے اس نے پیچ و تاب کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ گئیں۔'' گدھے۔۔۔۔۔تمہاری محبت ہی کہاں رہے گی۔ جب تم نہ ہوگے۔۔۔۔۔تمہاری وہ۔۔۔۔۔کیا نام ہے اس بھڑوی کا ۔۔۔۔۔جب وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کا خاندان تک نہ رہے گا۔۔۔۔۔تم سکھ ہو۔۔۔۔۔خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو!''

ترلوچن بھنا گیا۔ ''بکواس نہ کرو!''

موذیل زور سے ہنسی۔ مہین مہین بالوں کے غبار سے اٹی ہوئی بانہیں اس نے ترلوچن کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھول کر کہا۔ ''ڈارلنگ، چلو، جیسے تمہاری مرضی۔۔۔۔۔جاؤ پگڑی پہن آؤ۔ میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ ترلوچن نے اسے روکا۔ ''تم کپڑے نہیں پہنو گی!''

موذیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ ''نہیں۔۔۔۔۔چلے گا اسی طرح۔''

اس نے اپنے عورت پن کا سہارا لیا۔

''ترلوچن سخت خوفزدہ تھا۔ کوئی پتا کھڑکتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ مگر موذیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی۔ سگریٹ کا دھواں اڑاتی جیسے وہ بڑی بےفکری سے چہل قدمی کر رہی ہے۔

چوک میں پہنچے تو پولیس مین کی آواز گرجی۔ ''اے۔۔۔۔۔کدھر جا رہا ہے۔''

ترلوچن سہم گیا۔ موذیل آگے بڑھی اور پولیس مین کے پاس پہنچ گئی اور بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر کہا ۔''اوہ، تم۔۔۔۔۔ہم کو پہچانا نہیں تم نے۔۔۔۔۔موذیل۔۔۔۔۔پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا۔ ''ادھر اس باجو ۔۔۔۔۔ہمارا بہن رہتا ہے، اس کی طبیعت خراب ہے۔۔۔۔۔ڈاکٹر لے کر جا رہا ہے۔۔۔۔۔''

سپاہی اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے خدا معلوم کہاں سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی اور ایک سگریٹ نکال کر اس کو دیا۔ ''لو پیو۔۔۔۔۔''

سپاہی نے سگریٹ لے لیا۔ موذیل نے اپنے منہ سے سلگا ہوا سگریٹ نکالا اور اس سے کہا۔ ''ہیئر از لائٹ!''

سپاہی نے سگریٹ کا کش لیا۔موذیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں آنکھ ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف چل دی۔۔۔۔۔جس میں سے گذر کر اسے ۔۔۔۔۔محلے جانا تھا۔

ترلوچن خاموش تھا،مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موذیل کرفیو کی خلاف ورزی کرکے ایک عجیب وغریب قسم کی مسرت محسوس کر رہی ہے۔۔۔۔۔خطروں سے کھیلنا اسے پسند تھا۔وہ جب جوہو پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لیے ایک مصیبت بن جاتی تھی۔سمندر پیل تن لہروں سے ٹکراتی،بھڑتی وہ دور تک نکل جاتی تھی اور اس کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ کہیں وہ ڈوب نہ جائے۔جب واپس آتی تو اس کا جسم نیلوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا مگر اسے ان کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔

موذیل آگے آگے تھی۔ترلوچن اسکے پیچھے پیچھے۔ڈر ڈر کے ادھر ادھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی بغل میں سے کوئی چھری مار نمودار نہ ہو جائے۔موذیل رک گئی۔جب ترلوچن پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا ترلوچ ڈیئر۔۔۔۔اس طرح ڈرنا اچھا نہیں ۔۔۔۔تم ڈرو گے تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا۔۔۔۔۔سچ کہتی ہوں ، یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے۔"

وہ بے باک اور لا پرواہ تھی۔

دونوں چلنے لگے۔۔۔۔۔ایک آدمی جو سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ترلوچن سے ٹکرا گیا۔پرات گر گئی۔اس آدمی نے غور سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔اس آدمی نے جلدی سے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالا۔۔۔۔کہ موذیل آ گئی۔لڑکھڑاتی ہوئی جیسے نشے میں چور ہے۔اس نے زور سے اس آدمی کو دھکا دیا اور مخمور لہجے میں کہا۔اے کیا کرتا ہے۔۔۔۔۔اپنے بھائی کو مارتا ہے۔۔۔۔۔ہم اس سے شادی بنانے کو مانگتا ہے۔"پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی۔کریم۔۔۔۔۔اٹھاؤ،پرات اور رکھ دو اسکے سر پر۔"

اس آدمی نے نیفے میں سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں سے موذیل کی طرف دیکھا،پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹہوکا دیا۔"عیش کر سالی۔۔۔۔۔عیش کر۔" پھر اس نے پرات اٹھائی اور یہ جا، وہ جا۔

ترلوچن بڑبڑایا۔"کیسی ذلیل حرکت کی ہے حرامزادے نے۔!"

موذیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا۔"کوئی ذلیل حرکت نہیں۔۔۔۔۔سب چلتا ہے۔۔۔۔۔آؤ۔"

اسے خطروں سے کھیلنا آتا تھا۔

جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑ بڑ دکھائی دی۔۔۔۔۔ایک آدمی بڑی تیزی سے اس کنارے والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کنارے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔فٹ پاتھ پر انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور بڑی پھرتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔موذیل ٹھٹک گئی۔اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔پھر اس نے ہولے سے کہا۔''ترلوچن ڈیئر۔۔۔۔۔یہ پگڑی اتار دو!''

ترلوچن نے جواب دیا۔''میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اتار سکتا۔''

موذیل جھنجلا گئی۔تمہاری مرضی۔۔۔۔۔لیکن تم دیکھتے نہیں،سامنے کیا ہو رہا ہے۔''

سامنے جو کچھ ہو رہا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا۔۔۔۔۔صاف گڑ بڑ ہو رہی تھی اور بڑی پراسرار قسم کی۔ دائیں ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر بوریاں اٹھائے نکلے تو موذیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ان میں سے کچھ گاڑھی گاڑھی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی۔موذیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔غالباً وہ سوچ رہی تھی۔جب یہ دونوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے ترلوچن سے کہا۔''دیکھو،ایسا کرو۔۔۔۔۔میں بھاگ کر نکڑ والی بلڈنگ میں جاتی ہوں۔۔۔۔۔تم میرے پیچھے آنا۔۔۔۔۔بڑی تیزی سے،جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو۔۔۔۔۔سمجھے۔۔۔۔۔مگر یہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہو۔''

موذیل نے ترلوچن کے جواب کا انتظار کیا اور نکڑ والی بلڈنگ کی طرف کھڑاؤں کھٹکھٹاتی بڑی تیزی سے بھاگی۔ ترلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔چند لمحوں میں وہ بلڈنگ کے اندر تھے۔۔۔۔۔سیڑھیوں کے پاس۔ترلوچن ہانپ رہا تھا۔ مگر موذیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔اس نے ترلوچن سے پوچھا۔''کون سا مالا؟''

ترلوچن نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔''دوسرا۔''

''چلو۔''

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ترلوچن اس کے پیچھے ہو لیا۔زینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ان کو دیکھ دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔

دوسرے مالے پر پہنچے تو کوری ڈور میں کچھ دور جا کر ترلوچن نے ہولے سے ایک دروازے پر دستک دی۔موذیل

دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔''

وہ قربان ہونا جانتی تھی اور۔۔۔۔۔۔

''کرپال کور ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موذیل نے آناً فاناً اس کی قمیض اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ کرپال کور نے اپنی بانہوں میں اپنے ننگے جسم کو چھپا لیا اور وحشت زدہ ہو گئی۔ ترلوچن نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ موذیل نے اپنا ڈھیلا ڈھالا کرتہ اتارا اور اس کو پہنا دیا۔ خود وہ ننگ دھڑنگ تھی۔ جلدی جلدی سے اس نے کرپال کور کا آزار بند ڈھیلا کیا اور اس کی شلوار اتار کر، ترلوچن سے کہنے لگی۔''جاؤ، اسے لے جاؤ۔۔۔۔۔لیکن ٹھہرو۔''

یہ کہ کر اس نے کرپال کور کے بال کھول دیئے اور اس سے کہا۔''جاؤ۔۔۔۔۔جلدی نکل جاؤ۔''

ترلوچن نے اس سے کہا۔''آؤ'' مگر فوراً ہی رک گیا۔ پلٹ کر اس نے موذیل کی طرف دیکھا جو دھوئے دیدے کی طرح ننگی کھڑی تھی۔ اس کی بانہوں پر مہین مہین بال سردی کے باعث جاگے ہوئے تھے۔

''تم جاتے کیوں نہیں ہو؟'' موذیل کے لہجے میں چڑچڑا پن تھا۔

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔''اس کے ماں باپ بھی تو ہیں۔''

''جہنم میں جائیں وہ۔۔۔۔۔تم اسے لے جاؤ۔''

''اور تم؟''

''میں آ جاؤں گی۔''

ایک دم اوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑا دھڑ نیچے اترنے لگے۔ دروازے کے پاس آ کر انہوں نے کوٹنا شروع کر دیا۔ جیسے وہ اسے توڑ ہی ڈالیں گے۔

کرپال کور کی اندھی ماں اور اس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔

موذیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیف جھٹکا دے کر اس نے ترلوچن سے کہا۔''سنو۔ اب صرف ایک ہی ترکیب میری سمجھ میں آتی ہے۔۔۔۔۔میں دروازہ کھولتی ہوں۔۔۔۔۔''

کرپال کور کے خشک حلق سے چیخ نکلتی نکلتی دب گئی۔''دروازہ۔''

موذیل، ترلوچن سے مخاطب رہی۔''میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں۔۔۔۔تم میرے پیچھے بھاگنا

۔۔۔۔۔میں اوپر چڑھ جاؤں گی ۔۔۔۔۔تم بھی اوپر چلے آنا۔۔۔۔۔یہ لوگ دروازہ توڑ رہے ہیں۔سب کچھ بھول جائیں گےاور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے۔۔۔۔۔"

ترلوچن نے پھر پوچھا۔"پھر؟"

موذیل نے کہا۔"یہ تمہاری ۔۔۔۔۔کیا نام ہے اس کا ۔۔۔۔۔موقع پا کر نکل جائے۔۔۔۔۔اس لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا۔"

"موذیل اندھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھی ۔۔۔۔۔کھڑاؤں اس کے پیروں میں تھی ۔۔۔۔۔وہ لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے سنبھل کر ان کے تعاقب میں دوڑے۔موذیل کا پاؤں پھسلا۔۔۔۔۔اوپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ ہر پتھریلے زینے کے ساتھ ٹکراتی ۔لوہے کے جنگلے کے ساتھ الجھتی وہ نیچے آ رہی ۔۔۔۔۔پتھریلے فرش پر

ترلوچن ایک دم نیچے اترا۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔منہ سے خون بہہ رہا تھا۔کانوں کے رستے بھی خون نکل رہا تھا۔وہ جو دروازہ توڑنے آئے تھے ارد گرد جمع ہو گئے ۔۔۔۔۔کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔سب خاموش تھے اور موذیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے۔جس پر جا بجا خراشیں پڑی تھیں۔

ترلوچن نے اس کا بازو ہلایا اور آواز دی۔"موذیل۔۔۔۔۔موذیل۔"

موذیل نے اپنی بڑی بڑی یہودی آنکھیں کھولیں جو لال بوٹی ہو رہی تھیں اور مسکرائی۔

ترلوچن نے اپنی پگڑی اتاری اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔موذیل پھر مسکرائی اور آنکھ مار کر اس نے ترلوچن سے منہ میں خون کے بلبلے اڑاتے ہوئے کہا۔"جاؤ، دیکھو۔۔۔۔۔میرا انڈرویئر وہاں ہے کہ نہیں ۔۔۔۔۔میرا مطلب ہے وہ۔۔۔۔۔"

ترلوچن اس کا مطلب سمجھ گیا مگر اس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موذیل نے غصے میں کہا۔"تم سچ مچ سکھ ہو ۔۔۔۔۔جاؤ دیکھ کر آؤ۔"

ترلوچن اٹھ کر کرپال کور کے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔موذیل نے اپنی دھندلی آنکھوں سے آس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ یہ میاں بھائی ہے۔۔۔۔۔لیکن بہت واوا قسم کا۔۔۔۔۔میں اسے سکھ کہا کرتی ہوں۔"

ترلوچن واپس آ گیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں موذیل کو بتا دیا کہ کرپال کور جا چکی ہے۔۔۔۔۔موذیل نے اطمینان کا سانس لیا۔۔۔۔۔لیکن ایسا کرنے سے بہت سا خون اس کے منہ سے بہہ نکلا۔ ''اوہ ڈیم اٹ۔۔۔۔۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی کلائی سے اپنا منہ پونچھا اور ترلوچن سے مخاطب ہوئی۔ آل رائٹ ڈارلنگ ۔۔۔۔۔بائی بائی۔''

ترلوچن نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر لفظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹائی۔ ''لے جاؤ اس کو۔۔۔۔۔اپنے اس مذہب کو۔'' اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہو کر گر پڑا۔

(موذیل از سڑک کنارے)

